نویدہ ظفر کیانی

خوابوں کی پرندگی

ساتواں مجموعۂ کلام

نوید ظفر کیانی

مکتبۂ اُمغانِ ابتسام

https://archive.org/details/@nzkiani
nzkiani@gmail.com

یوں گھات میں گولیاں بہت ہیں
خوابوں کی پرندگی وہی ہے

ہرے دنوں کی آس میں

مجموعۂ کلام	خوابوں کی پرندگی
صفحات	۲۰۳
شاعر	نوید ظفر کیانی
طبعِ اوّل	۹ مئی ۲۰۲۵ء
تعداد	لاتعداد
ناشر	مکتبۂ ارمغانِ ابتسام، اسلام آباد
ای میل	nzkiani@gmail.com
ویب سائٹ	http://archive.org/@nzkiani
قیمت	۱۰۰۰ روپے
	۱۲ امریکی ڈالر

فہرست

۱	آنکھ میں بھرلوں اگر دیدۂ بینا اللہ (حمد باری تعالیٰ)	۱۳
۲	ڈال دے الطاف کا صدقہ سرِ دستِ دعا (دعا)	۱۵
۳	جب میں اپنے آپ سے نکلا مدینے کے لئے (نعت رسولِ مقبول)	۱۷
۴	ظلمت میں اجالوں کی تمہید ضروری ہے	۱۹
۵	سارے رستے جادۂ معدوم کے	۲۱
۶	تمہاری یاد کا احسان کچھ زیادہ ہے	۲۳
۷	۲۷ نومبر ۲۰۲۴ء (نظم)	۲۵
۸	جو ہر سے تیری یادوں کی جھلملاہٹ ہے	۲۷
۹	جب بھی غلط ہوا ہے کسی آشیاں میں کچھ	۲۹
۱۰	کشتِ قلزم میں اُگا تازہ ازل موجِ غزل	۳۱
۱۱	یہ نسلِ رواں کی سائیکی ہے	۳۵

۱۲	غم زدہ دوستو! (نظم)	۳۷
۱۳	کر نہ سکو گے جوششِ مئے ناب میں بھی حل	۳۹
۱۴	مسکرانا ہے، اُس نے جانا ہے	۴۱
۱۵	خوابِ سحر لباس بدلتا ہے شام تک	۴۳
۱۶	ایک سفر پھر پسِ سفر ہے، جاگو بھی	۴۵
۱۷	اگر مجبور کر دو گے، نگر بولیں گے اب کے	۴۸
۱۸	ہمارے درمیاں کچھ چل رہا ہے	۵۰
۱۹	مجھ سے کرنے کو گفتگو آیا	۵۲
۲۰	کرتا پھروں نہ سب سے وضاحت، خدا کرے	۵۴
۲۱	کھلی فضاؤں کا ہے ترجمان مٹھی میں	۵۶
۲۲	سانپ کی کینچلی مستقر کیوں لگے	۵۸
۲۳	زمین و آسماں جو مستقر کا استعارہ ہے	۶۰
۲۴	تیری آنکھیں فسانوں کا فانوس ہیں	۶۱
۲۵	چاند نکل آیا (نظم)	۶۳
۲۶	دِل کا سفر ہے اور وہ ہمراہ چل رہے ہیں	۶۵
۲۷	کیا خبر تھی ہو گی اِتنی ساقئ رعنا میں آگ	۶۷
۲۸	شعلگی لُو کی ہے اور موج صبا والی ہے	۶۹

۲۹	ڈھونڈتا پھرتا ہے کس کو لامکاں تک، اب تو رُک	۷۱
۳۰	وہ لبِ خموش ہو گئے کچھ بات کرتے کرتے	۷۳
۳۱	وقت نے بدلے نہیں ہیں طورِ غم	۷۵
۳۲	تیری آنکھوں کی چمک سے کس قدر چندھیا گئے	۷۷
۳۳	ہم (نظم)	۷۹
۳۴	یہ نخلستان دھوکا دشت کا ہے	۸۱
۳۵	ایسی بنادی جائے گی حالات کی سرنگ	۸۳
۳۶	تیرہ شب میں یہ ڈر پل رہا ہے	۸۵
۳۷	جبر کرنے کو ہے برہم عنقریب	۸۷
۳۸	زندہ ہیں کس دور میں	۸۰
۳۹	پاکستان کی خاطر (نظم)	۹۱
۴۰	ذوقِ نظر نے ایسا الجھا دیا نظر کو	۹۳
۴۱	تُو زندگی تھا، تجھ کو بسر کر چکا ہوں میں	۹۵
۴۲	ڈوب کر بھی کوئی وحدت میں ہوا نہ گم سم	۹۷
۴۳	جہاں جینے کا ساماں تھا وہاں مرتا ہوا پہنچا	۱۰۰
۴۴	کششِ ثقل کو سدھالیں ہم	۱۰۱
۴۵	دِل کو یوں تیرے غم کے ثوابوں کا شوق ہو	۱۰۳

۴۶	دِل اُگا آئیں، جگر بو آئیں	۱۰۵
۴۷	دنیا کے ہاتھ تیرے لگانے میں لگ گئے	۱۰۷
۴۸	تجھ سے روٹھا تو میں تیری دنیا سے ہی چلا گیا	۱۰۹
۴۹	ارادے مجتمع کر، سلسلہ مکمل کر	۱۱۱
۵۰	جشنِ آزادی مبارک (نظم)	۱۱۳
۵۱	ہجر کے ہر لمحے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں	۱۱۵
۵۲	کیسے ہوتا راج بدروحوں سے گلزارِ پرند	۱۱۷
۵۳	اپنی بربادی پہ کیوں سب سے جلے بیٹھے ہیں	۱۱۹
۵۴	وہ ہم سے مل کے ہماری ہی سوچ میں گم تھیں	۱۲۱
۵۵	یاد بھی رنگِ صبا رکھتی ہے	۱۲۳
۵۶	فلک کے پیڑ سے لائیں گے توڑ کر تارے	۱۲۵
۵۷	دیکھ کے میرے بال و پر میں پروازوں کا دھوکا سا	۱۲۷
۵۸	ظلمت میں کب تنہا سا ہے چاند یہاں	۱۲۹
۵۹	جبر اوہام ہے، اب اہلِ یقیں بول پڑیں	۱۳۱
۶۰	خود اپنے ہاتھوں ہوں مطعون، دوسرا تو نہیں	۱۳۳
۶۱	عجب ہوں سائیکو سپنوں کی سخت کوشی میں	۱۳۵
۶۲	کوئی مسئلہ بنوں تو کسی امتحاں پہ پہنچوں	۱۳۶

٦٣	ہجر ہے اور فردا میں بل کھاتا اِس کا خوف ہے	۱۳۸
٦٤	جو غمِ دستار میں پڑتا نہیں	۱۴۰
٦٥	وقت کی اسفنج سے نچڑی ہوئی ہے یاد پھر	۱۴۲
٦٦	دیوانہ ہر اِک خواب کی تعبیر بھی چاہے	۱۴۴
٦٧	خود کو اوہام کی دلدل سے نکالیں صاحب!	۱۴٦
٦٨	مُٹھی بھر ہائیکو	۱۴۹
٦٩	وقت، لگتا ہے کہ میرا نہیں آنا جیسے	۱۵۵
٧٠	یار! کیا ترکِ تعلق کی میں تعلیل کروں	۱۵٧
٧١	یہ رُتیں ہیں دوسروں کے گھر تلک	۱۵۹
٧٢	میں جس پہ اپنی نگاہوں کا رنگ کر لیتا	۱٦۱
٧٣	دِل، مرا دِل تیری یادوں کا عجائب خانہ	۱٦۳
٧٤	عبث ہے ماہ و سال میں مری تلاش	۱٦۵
٧٥	جو بس میں نہیں اُس کا ارادہ نہ کیا کر	۱٦٧
٧٦	گزر اوقات کا باعث رہی ہیں	۱٦۹
٧٧	خدائی بھی نہیں باقی، خداؤں میں دھرا کیا ہے	۱٧۱
٧٨	قضا اِس دل سے شرمندہ ہے اب تک	۱٧۳
٧٩	ڈر کے گرداب میں چکراؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!	۱٧٦

۸۰	پھر رقصِ بھونچالی کرنا ہی پڑتا ہے	۱۷۷
۸۱	اِتنا تیرا نہیں بنا ہوں میں	۱۷۹
۸۲	شکاری بھی خوش ہیں شکاروں سے بچ کے	۱۸۱
۸۳	میں رُک گیا ہوں، سمے کی روانی جاری ہے	۱۸۳
۸۴	میرے اُس دِل کے جزیرے پہ نشاں تھے ہی نہیں	۱۸۵
۸۵	صدیاں جو کسی ساعتِ رفتہ سے جھڑی ہیں	۱۸۶
۸۶	چُپ میں بھی ہے عجیب فسوں بولتا ہوا	۱۸۸
۸۷	ظلمتِ جبر ہے اور تا بہ فلک سکتے ہیں	۱۹۰
۸۸	جانے والوں کے غم ایک مدت سے ہیں	۱۹۱
۸۹	بہر سو ہے خلائے بیکرانہ	۱۹۳
۹۰	کیوں ٹٹولے کوئی اندازہ تبسم میرا	۱۹۵
۹۱	کون منظر سے گیا، بے منظری کم پڑ گئی	۱۹۶
۹۲	یادوں کی بس اُڑی اُڑی تحریروں میں رہ جائیں گے	۱۹۸
۹۳	چند دوہے	۲۰۰

حمد باری تعالیٰ

آنکھ میں بھر لوں اگر دیدۂ بینا اللہ
سہلِ نظارہ بنے جلوۂ سینا اللہ

میرے ادراک کو جس چاک پہ رکھا ہوا ہے
اُس سطح پہ اُتر آئے تیرا زینہ اللہ

تیرے جلووں کا عجائب کدہ ہے یہ دنیا
دیکھنے والوں کو درکار قرینہ اللہ

تو نے ہر نشۂ عالم سے سرافراز کیا
میرے ہاتھوں میں ہے ہر ساغر و مینا اللہ

میرے سجدے تو نہیں اذنِ سفر کے مرہون
میرا گھر ہے میرا مکہ و مدینہ اللہ

عشق اُترے تو گلستان کھلا سکتا ہے
ممتحن شعلوں کو آ جائے پسینہ اللہ

کیمیا ہو یہ مری خاک تمازت سے تری
سنگِ بے مایہ کو بھی کر دے نگینہ اللہ

لامکاں ہو کہ مکاں، سب اِسی نقطے کے اسیر
تیری کھینچی ہوئی حد میں رہے جینا اللہ

یہ جبیں میری فسانۂ سماوات لکھے
ہوں یہی لوح و قلم میرا خزینہ اللہ

تیری نظروں میں ہے خاموش ندامت سب کی
آنکھ میں ہو کہ نہ ہو دل کا دفینہ اللہ

مجھ کو تسلیم کہ کم مایہ ہے تہذیبِ ثنا
سر پٹختا ہے کناروں سے سفینہ اللہ

دعا

ڈال دے الطاف کا صدقہ سرِ دستِ دعا
میں سراپا اشک ہوں مولا سرِ دستِ دعا

دِل نے ہے کھولی ہوئی اک بے زبانی کی لغت
خامشی ٹھہری لبِ گویا سرِ دستِ دعا

چشم ہائے نم ہیں اور دیوانہ وار اس کا طواف
جیسے آیا ہو نظر کعبہ سرِ دستِ دعا

تیری رحمت کی طرف دیکھوں تو پھر کچھ بھی نہیں
دامن دل بے طرح پھیلا سرِ دستِ دعا

اَٹ گئی ہے رحم دل نظروں سے ساری کائنات
عاجزی کا رنگ ہے یکتا سرِ دستِ دعا

آخرش گردابِ عصیاں سے رہائی مل گئی
آ گیا ہے اب ترا بندہ سرِ دستِ دعا

میرے احساس ندامت نے کیا آراستہ
عرش کو جاتا ہوا رستہ سرِ دستِ دعا

چاہیے اِس کو بھی تیرے جود کا جامِ طہور
آرزُو ہے صورتِ مینا سرِ دستِ دعا

نعت رسولِ مقبول

جب میں اپنے آپ سے نکلا مدینے کے لئے
گھاٹیوں نے دے دیا رستا مدینے کے لئے

عکس میرے اُس دیارِ نور کا حصہ بنیں
منعکس کر دے یوں آئینہ مدینے کے لئے

قافلے جیسا بنا ڈالا تھا جذبوں نے مجھے
چل پڑا تھا میں تن تنہا مدینے کے لئے

محوِ نظارہ ہوا دل دیدۂ پر شوق میں
ہر دریچہ وقت نے کھولا مدینے کے لئے

جادۂ دل کب رہا خالی کہ ہم نے ہر گھڑی
قافلہ عشاق کا دیکھا مدینے کے لئے

آبلے پاؤں کے پہیوں کی طرح لگنے لگے
رہگذارِ گُل بنا صحرا مدینے کے لئے

سرخوشی پردیس سے گھر جانے والی سی ہے کچھ
نکلا ہوں گھر کے لئے میں یا مدینے کے لئے

ساقیٔ کوثر پلائیں گے مئے لطف و کرم
چل اُٹھا کے ساغر و مینا مدینے کے لئے

شافعِ روزِ جزا کے پاس ہے اِن کا علاج
کیوں نہ رکھ لوں میں غمِ عقبیٰ مدینے کے لئے

ظلمت میں اُجالوں کی تمہید ضروری ہے
ننھے سے دئیے کی بھی تائید ضروری ہے

جھونکے تو نہیں جاتے روندے ہوئے گوشوں میں
خوشبو کو مگر پھر بھی تاکید ضروری ہے

میں اُس کا رہوں کیسے جو میرا نہ ہو پائے
مانا کہ محبت میں توحید ضروری ہے

ممکن ہے کہ آتش میں گلزار ہی کھل اُٹھیں
حالات ہوں جیسے بھی امید ضروری ہے

چھوڑے ہوئے رستوں پر کھو آئے کہاں خود کو
بھولے ہوئے رشتوں کی تجدید ضروری ہے

جس جنگ میں اُترے ہیں کیا جانے وہ ہے کس کی
کیوں دونوں طرف ہم ہیں، پُرسید ضروری ہے

یہ دنیا محل ٹھہری اِک تاش کے پتّوں کی
سقراط مزاجوں کی تقلید ضروری ہے

رہنی تھیں بھلا کب تک شب زاد بلائیں بھی
بول اُٹھیں فضائیں بھی خورشید ضروری ہے

جس اور قدم رکھوں رستوں کو بہم کرلوں
یا دھند میں خود اپنی تردید ضروری ہے؟

جو کہہ نہ سکیں اب کے مقروضِ قلم ہیں وہ
جو سن نہ سکیں اُن پر تنقید ضروری ہے

سارے رستے جادۂ معدوم کے
تیرے کوچے سے گئے ہیں گھوم کے

تندیٔ بادِ مخالف بھی بجا
حوصلے بھی ہیں اِسی مفہوم کے

جا کے برسے ہیں سمندر پر کہیں
آئے تھے صحرا پہ بادل جھوم کے

تیرے دیوانوں کی جب جاں پر بنے
لوٹ جائیں بھاری پتھر چوم کے

بن گئے ہیں قرضۂ لوح و قلم
کتنے ہی قصے دلِ مرحوم کے

وقت کی دیوار میں چنوا گئے
خواب گر آزادئ موہوم کے

کیا بتاؤں کس لئے ظالم سماج
سر ہوا ہے خواہشِ معصوم کے

اصطلاحِ ظرف خود پیدا کریں
یا مساوی ہوں گل مشموم کے

ایک لفظِ اشک بھی ٹپکا نہیں
حوصلے ہیں دیدۂ مغموم کے

تمہاری یاد کا احسان کچھ زیادہ ہے
قلی کے سر پہ یہ سامان کچھ زیادہ ہے

ابھی کھلا کہاں سارا طلسمِ ہوشربا
یہ آئینہ ابھی حیران کچھ زیادہ ہے

یہ شہر جس کو کسی آن بھی قرار نہیں
تمہارے جاتے ہی سنسان کچھ زیادہ ہے

غمِ حیات کے قضئے بھی میں چکا لوں گا
میں مانتا ہوں کہ بحران کچھ زیادہ ہے

اِسی سبب سے وفا کی طمع ہے مجھ کو بھی
یہ فائدہ ہے کہ نقصان کچھ زیادہ ہے

نجانے کتنے ہی برسوں سے اِس گمان میں ہوں
تمہارے آنے کا امکان کچھ زیادہ ہے

جہاں پہ چیخنا چلانا بنتا تھا سب کا
وہاں خموشی کا رجحان کچھ زیادہ ہے

اَکیلگی کو ہی تعزیر کیا بتاتے ہو
رفاقتوں کا بھی تاوان کچھ زیادہ ہے

ہوا کے ساتھ نہ آیا اُسے کبھی چلنا
ظفرؔ کا کیا کریں، نادان کچھ زیادہ ہے

۲۷ نومبر ۲۰۲۴ء

اب مرے ملک میں ہر آن کا خطرہ ہے مجھے
اِس بڑی جیل میں بھی جان کا خطرہ ہے مجھے

کل کے افسانے کی سرخی تھیں فقط چند جانیں
آج نقصان سے نقصان کا خطرہ ہے مجھے

کل تو بس خلق خدا لے کے اٹھی تھی پرچم
اب کسی اور ہی طوفان کا خطرہ ہے مجھے

گولیوں سے تو بغاوت ہی نمو پائے گی
ایسے حل سے کسی بحران کا خطرہ ہے مجھے

چڑھ کے اسلامی قلعے پر میں عبادت کیا کروں
قتل کر دے گا، مسلمان کا خطرہ ہے مجھے

ایسی سفاکی بھلا ان میں کہاں ہوتی ہے
کب درندوں سے ہے، انسان کا خطرہ ہے مجھے

اپنا گھر بھی مجھے محفوظ نہیں لگتا ہے
کیسے بتلاؤں کہ دربان کا خطرہ ہے مجھے

ایک اُمید کے دامن کو پکڑ رکھا ہے
ایک جاں لیوا سے امکان کا خطرہ ہے مجھے

میرا کہنا ہے کہ عمران ہے امید مری
اُس کا کہنا ہے کہ عمران کا خطرہ ہے مجھے

جو ہر سمے تیری یادوں کی جھلملاہٹ ہے
رواں اِسی سے مری زندگی کا سرکٹ ہے

نہ جانے کب کوئی گزرا تھا جادۂ دل سے
حنوط کب سے سماعت میں ایک آہٹ ہے

سفر نصیب گلہ ہائے رہگذر کیا کرے
کہ دِل دھڑکنے تلک ہر طرح کا جھنجھٹ ہے

کسی کے نام تو لکھا گیا ہے موسمِ گل
پلٹنے والا کوئی تو رُتوں کا گھونگھٹ ہے

تمہارا جام مرے کام کا نہیں ساقی!
بنامِ تشنہ لبی راستے میں پنگھٹ ہے

یہی تو ہے مرے سوزِ درُوں کا آئینہ
جلا ہوا جو مری انگلیوں میں سگریٹ ہے

اِسی اُفق پہ کئی مہر و ماہ ڈوبے ہیں
یہ میرا سینہ نہیں رفتگاں کا مرگھٹ ہے

کسی کو ذات کی تنہائیوں نے مار دیا
کسی کے واسطے تاروں کا کوئی جھرمٹ ہے

چراغ بن کے کہاں تک میں جا سکوں گا ظفرؔ
کہ ظلمتوں سے پرے بھی تو شب کی چوکھٹ ہے

جب بھی غلط ہوا ہے کسی آشیاں میں کچھ
تو آگ بول اُٹھی دھوئیں کی زباں میں کچھ

تو کیا اِسی کے واسطے شب سے لڑے رہے
یہ دُھوپ جیسا ہے جو سحر کی دکاں میں کچھ

لمحوں کے اِرتباط سے عمریں کشید ہوں
تبدیل ہو نہ جائے اگر درمیاں میں کچھ

یہ اور بات کر گیا برباد بھی وہی
مجھ کو رہا تحفظ اُسی کی اماں میں کچھ

ادراک قافلے میں بھی ہوتے ہوئے نہیں
تحریک بن رہا ہے مرے ہمرہاں میں کچھ

مہنگا بساط سے ہے نشہ، پھر بھی نہ چھٹے
لذّت ملی ہے ایسی غمِ جاوداں میں کچھ

مجھ کو نظر لگا گئی حسنِ نظر مری
یا تیر تھے تمہارے بدن کی کماں میں کچھ

اُس نے مرے یقین کو رستہ نہیں دیا
جو عکس جھلملاتا تھا رنگِ بیاں میں کچھ

میں نے بھی دِل کے کہنے میں آجانا تھا ظفرؔ
لیکن تری "نہیں" میں تھا کچھ اور "ہاں" میں کچھ

کشتِ قلزم میں اُگا تازہ ازل موجِ غزل
پانیوں میں تُو چلاتی تو ہے ہل موجِ غزل!

ہمہ اوقات روانی ترا اسلوب بنے
لے کے پھرتی رہے یادوں کے کنول موجِ غزل

جب بھی روکیں یہ کنارے، یہ چٹانیں تجھ کو
بن کے جھرنا تو پہاڑوں سے نکل، موجِ غزل

یہ تموج تو ازل سے ہے ترا رنگِ خرام
قُربِ ساحل پہ بھی خود سے نہ نکل موجِ غزل

یہ سمندر تیری قیمت کہاں دینے والا
اَبر میں ڈھل کسی صحرا کو ہی چل، موجِ غزل

قفسِ ظلمتِ شب کو ہی سمجھتے نہیں بخت
چاند کے واسطے رہ رہ کے مچل موجِ غزل

برف زاروں کی تو صحبت میں نہ رہ، برف نہ بن
اپنی وحشت کی تمازت سے پگھل موجِ غزل

ویسے گوہر تو نکلتا نہیں ہر سیپی سے
کچھ غزالوں کی ہے ہر بات غزل موجِ غزل

باندھ پائے نہ عدو بند ترے ہونٹوں پر
خود کو طوفان بناتی ہوئی چل موجِ غزل

تیرا ابلاغ تو ہر رنگ سے، ہر ڈھنگ سے ہے
کبھی دھیرے سے کبھی رشکِ بگل، موجِ غزل

اِس کے پانی پہ کبھی اپنا شکارہ تو چلا
لے ملالے گی تری لے سے یہ ڈل، موجِ غزل

تونے دیکھے نہ کبھی بحرِ زماں کے تیور
تیری مستی میں کوئی آج نہ کل موجِ غزل

کچھ نہ کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست ہو گی
یونہی گرداب نہیں سارا ہی جل موجِ غزل

یونہی لفظوں کے طلاطم سے بھلا کیا حاصل
مسئلے ایسے نہیں ہوتے ہیں حل موجِ غزل

ساری نظریں تیرے لہجے کی دھنک سے کھیلیں
ہر طرف ہیں تیرے خوشبو کے محل، موجِ غزل

کتنی مرغابیاں اُتری ہیں ترے سینے پر
بسکہ تو بخل نہ کر، رزق اُگل، موجِ غزل

ریت پر لوگ گھروندے بھی بنا لیتے ہیں
دھیان کر، اپنی حدوں سے نہ پھسل موجِ غزل

پھونکتی رہتی ہے بے مہر معیشت اکثر
یہ ہوا ہی نہ نکالے ترے بل، موجِ غزل

کتنے پاتال لئے پھرتی ہے تُو یادوں کے
ہوگیا جن سے تراشا نہ ہی شل، موجِ غزل

تُو فقط اپنی ہی مستی میں رہے گی کب تک
تھام لے دستِ سفینہ کسی پل، موجِ غزل

اِن جزیروں کی خموشی سے تو دَم گھٹتا تھا
شور کرتی ہے پئے ردِّ عمل موجِ غزل

یہ نسلِ رواں کی سائیکی ہے
چہروں پہ دِلوں کی مخبری ہے

کر دے جو خیال و خواب گنجل
وہ آگہی عکس گمرہی ہے

یہ فیصلہ منصفوں کا ٹھہرا
سچائی سدا سے سازشی ہے

جس کے لئے کاخ بن رہے ہیں
وہ زیست کیا ہے، مسافری ہے

پھیلا ہے یہ جھٹپٹا سا کیسا
کہنے کو تو رات کٹ گئی ہے

یوں گھات میں گولیاں بہت ہیں
خوابوں کی پرندگی وہی ہے

یہ ردِّ عمل سے لگ رہا ہے
کہ چیخ نہیں ہے خامشی ہے

فتوے جو لگانے ہیں، لگا لو
ہم کو بھی شعورِ کافری ہے

بچھڑے ہوئے جھانکتے ہیں ہر سو
چائے کی مہک بلا رہی ہے

غم زدہ دوستو!

غم زدہ دوستو!
جیت لو وقت کو
پڑ گئی ہے جو بازی وہ ہارو نہیں

یہ زمانہ تو کب سے ہے پیچھے پڑا
دیدے دشنہ لئے
چہرہ آتش کئے
جیسے ہو سم پیئے
مجھ کو ڈر ہے یہی
خود کو کر کے ہدف
تم بھی اُن کی طرف
ہو نہ جاؤ کہیں، خود کو مارو نہیں

مانا ظلمت کدہ ہو گیا ہے جہاں
آج طوفاں سہی
رعد و باراں سہی
دِل پریشاں سہی
خود کو رکھو جمع
بادِ منہ زور کو
راس کوئی تو دو
ناامیدی کو دِل میں اُتارو نہیں

غم کی یہ رات کٹ جائے گی ایک دِن
یہ جو اندھیر ہے
وقت کا پھیر ہے
بس کوئی دیر ہے
نہیں، یہ کچھ نہیں
اِس سے ڈرنا نہیں
یونہی مرنا نہیں
دِل فگارو نہیں! شہریارو نہیں!!

کر نہ سکو گے جو شش مئے ناب میں بھی حل
جو غم ہوئے نہ وقت کی تیزاب میں بھی حل

اِک بے گھری کا کرب ہے اور اپنے گھر میں ہے
کچھ تو ہو اِس کا عالم اسباب میں بھی حل

میں زخم چاٹ چاٹ کے کرتا ہوں مندمل
بولو اگر ہے منبر و محراب میں بھی حل

اب بھی نہیں ہے اپنے سُر و لے سے مطمئن
خود کو مغنّی کر گیا مضراب میں بھی حل

تو کیا گزرنا ہو گا کسی آگ سے، خدا؟
یہ مسئلہ تو ہو نہ سکا خواب میں بھی حل

چھڑکوں دعائے خیر کی افشاں کہاں کہاں
یہ رات ہوگئی میرے مہتاب میں بھی حل

دِل کی اکیلگی نے وہ جھگڑا کھڑا کیا
ہو نہ سکا جو حلقۂ احباب میں بھی حل

شوقِ سفر ہی اگلے سفر کی بنا رکھے
ہو گی تھکن سفر کی تو اعصاب میں بھی حل

موجوں سے لڑتا لڑتا یہاں آیا تھا ظفرؔ
ساحل سے اچھا مل گیا گرداب میں بھی حل

مسکرانا ہے، اُس نے جانا ہے
دِل جلانا ہے، اُس نے جانا ہے

اُس کا رختِ سفر ہے اور میں ہوں
تانا بانا ہے، اُس نے جانا ہے

میں اسیرِ انا ہوں خود بھی مگر
اُس کو طعنہ ہے، اُس نے جانا ہے

کوئی روکے سے رُک سکا ہے بھلا
جس نے جانا ہے، اُس نے جانا ہے

ہائے کیسے بتاؤں کہ کیسے
دِل نے مانا ہے، اُس نے جانا ہے

تیری محفل ہو یا یہ دنیا ہو
جس نے آنا ہے، اُس نے جانا ہے

جان کر بھی کہ اُس کا جانا تو
پیمانہ ہے، اُس نے جانا ہے

اُس کو کہتا رہا تھا جانِ جاں
آزمانا ہے، اُس نے جانا ہے

دشتِ ہجراں ہے اور وہ بھی ظفرؔ
بیکرانہ ہے، اُس نے جانا ہے

خوابِ سحر لباس بدلتا ہے شام تک
سورج خود اپنی آگ میں جلتا ہے شام تک

شب کے سفر کو ٹھنڈا بنانے کے واسطے
صحرا کا ظرف کتنا اُبلتا ہے شام تک

آنکھوں پہ پٹی باندھے ہوئے روزگار کی
ہر کوئی پُل صراط پہ چلتا ہے شام تک

جاگنگ پہ جب وہ مجھ کو سویرے دکھائی دے
حدِ نظر کا منظر غزلتا ہے شام تک

میں کیا بتاؤں کیسا سفر ہے گمان کا
کیا کچھ لہو میں پھولتا پھلتا ہے شام تک

کرتا ہے دان شہر کو خوابِ سحر کی لو
اور پھر وہ اُس پہ ہاتھ بھی ملتا ہے شام تک

کوہِ ندا پہ گڑ نہ سکے کوہکن کی میخ
اپنی ترائیوں پہ پھسلتا ہے شام تک

پھر چاند بن کے رات نکلتا بھی ہے وہی
اژدر ہمارے دِن کو نگلتا ہے شام تک

لے جاتے ہیں سمیٹ کے اندھے سمے ظفرؔ
جتنا بھی دِن کا سونا پگھلتا ہے شام تک

ایک سفر پھر پسِ سفر ہے، جاگو بھی
ساحل پر اِک اور بھنور ہے جاگو بھی

ٹھیک کہ رستہ دیکھ رہے ہو سورج کا
پہلی کرن تمہیدِ سحر ہے، جاگو بھی!

نیند کی کس ظلمت سے بوجھل ہیں پلکیں
آگے دِن کا راہگذر ہے جاگو بھی

چاروں اور بگولے رقصاں ہیں کب سے
عفریتوں کی تم پہ نظر ہے، جاگو بھی

لمحوں کی چھکاریں اُمڈی پڑتی ہیں
غفلت کا احساس اگر ہے، جاگو بھی

کس خس خانہ و برفاب کے خواب میں ہو
گھر تو بے دیوار و در ہے، جاگو بھی

سب کے ارمانوں کی پیاس بجھائے گا
برگِ گل شبنم سے تر ہے، جاگو بھی

پہلے ٹھوکر کہیں کہیں پہ لگتی تھی
لیکن اب تو ڈگر ڈگر ہے، جاگو بھی

آئے تھے تم بادِ صبا کے دھوکے میں
آج یہاں پر رقصِ شرر ہے، جاگو بھی

جس کو خلدِ امن بنا کر سوئے تھے
دنیا کا بارود نگر ہے، جاگو بھی

ایک شجر کے پنچھی اِس پر لڑتے ہیں
کس کی چھاؤں، کس کا ثمر ہے، جاگو بھی

فصلِ گل کی خاک توقع رکھی جائے
قوسِ قزح تو خواب بدر ہے، جاگو بھی

تار بجا کر رکھ دیتی ہے روحوں کے
یہ چُپ کا مجذوب ہنر ہے، جاگو بھی

دیکھو! کون دِلوں پر دستک دیتا ہے
سب کا شاعر، سب کا ظفرؔ ہے، جاگو بھی

اگر مجبور کر دو گے، نگر بولیں گے اب کے
زبانیں کاٹ ڈالو گے تو سر بولیں گے اب کے

بجھاتے جاؤ گے بارود بنیادوں میں کب تک
جواب تک چپ رہے تھے وہ بھی گھر بولیں گے اب کے

جو میں نے بولنا ہے وہ لکھیں گے سب مورخ
جو پوچھو گے تو پھر میرے ہنر بولیں گے اب کے

تمہارے نقشِ پا کی بیعتیں جائز نہیں ہیں
اے میرِ کارواں اہلِ سفر بولیں گے اب کے

بلائیں کیوں بلاتی ہیں ہمیں کوہِ ندا کو
سنا تو ہے کہ سارے رہگذر بولیں گے اب کے

سروں پہ کس نے لا چھوڑی ہے اِتنی دھوپ آخر
یہ چھاؤں کس نے کاٹی ہے، شجر بولیں گے اب کے

ہمیں دیوار سے کب تک لگا سکتا ہے کوئی
بھرم رکھے ہوئے تھے ہم مگر بولیں گے اب کے

غزل کے کربلا میں جب بلا بیٹھے ہیں کوفی
قلم شمشیر بن کر بے خطر بولیں گے اب کے

ہماری چپ کو پابستۂ ڈر کر دینے والے
گماں رکھتے نہیں تھے کہ ظفرؔ بولیں گے اب کے

ہمارے درمیاں کچھ چل رہا ہے
بہ رنگِ داستاں کچھ چل رہا ہے

ابھی ہے ابر میں، کھلتا نہیں ہے
جو زیرِ آسماں کچھ چل رہا ہے

تو پھر رستہ بھی کٹ جانا تھا کچھ تو
اگر یہ کارواں کچھ چل رہا ہے

مآلِ کار ہو جائے گا ظاہر
بقولِ رازداں، کچھ چل رہا ہے

تری باتیں نہیں جب زیبِ محفل
نہیں لگتا یہاں کچھ چل رہا ہے

وہی اوراقِ سادہ روز و شب کے
مجھے تھا کیوں گماں کچھ چل رہا ہے

تری یادیں ہیں، شب ہے اور دل ہے
کھلی ہے اِک دکاں کچھ چل رہا ہے

سکوتِ مرگ میں ڈوبا نہ قصہ
پئے پسماندگاں کچھ چل رہا ہے

مری تنہائیوں میں ڈوبیں، اُبھریں
مکاں و لامکاں، کچھ چل رہا ہے

ظفرؔ میں خود تو رُسوا ہو نہ پایا
بفیضِ ایں و آں کچھ چل رہا ہے

مجھ سے کرنے کو گفتگو آیا
اور لے کر سکوتِ ہُو آیا

لکھنے بیٹھا ہوں داستاں کیسی
سرِ نوکِ قلم لہو آیا

سارا خمیازہ میرے گھر پہ گرا
پی کے جھونکا کہاں کی لُو آیا

مے ملی ہے اُنہی کے بختوں کی
رِند آئے تو پھر سبُو آیا

دیکھ کر میرے حوصلوں کا عزم
آسماں آپ رُوبرُو آیا

مجھ سے معکوس ہو کے گزرا ہے
موسمِ گُل یوں چار سُو آیا

چاند اُترا جو جھیل میں اکثر
مجھ کو ایسا لگا کہ تُو آیا

ظرف چھلکے سبھی کے رستے میں
آخری حد کو بھی میں چھُو آیا

اجنبی سا لگا میں خود کو بھی
آئینہ جب بھی رُوبرُو آیا

آزمائش ہے گویا اپنی ظفرؔ
اپنا دامن پیئے رفُو آیا

کرتا پھروں نہ سب سے وضاحت، خدا کرے
تُو ہی لگا دے درد کی قیمت، خدا کرے

ڈھلکیں نہ میری آنکھ سے لیکن وہ دیکھ لیں
جن کے لئے ہیں اشکِ ندامت، خدا کرے

جس میں مجھے دھکیلا ہے اُس کی جدائی نے
گزرے نہ اُس پہ ایسی قیامت، خدا کرے

میں نہ رہوں تو میری جگہ اور کوئی ہو
رُکنے نہ پائے جرمِ محبت، خدا کرے

بخشی گئی ہے ہم کو اگر خلعتِ حیات
جینے کی بھی ہو ساتھ سہولت، خدا کرے

برفابیوں کے اُتریں صحیفے نئے نئے
قائم رہے لہو کی حرارت خدا کرے

ہم اپنے آپ سے بھی سوا کیوں دکھائی دیں
پہنیں نہ سائے جامۂ قامت خدا کرے

اُس کو نگل نہ پائے بگولے زمان کے
وہ مشک خاک جس کی حفاظت خدا کرے

وہ جانے والا اور ہی معیار دے گیا
راس آئے مجھ کو اپنی رفاقت خدا کرے

کھلی فضاؤں کا ہے ترجمان مٹھی میں
اذان دے بھی تو کیسے بیان مٹھی میں

گو آسماں تھا مرے حوصلوں کی ٹھوکر پہ
خلا نے بھینچی ہوئی تھی اُڑان مٹھی میں

وہ آئیں گے، نہیں آئیں گے، جلد آئیں گے
مرا یقین ہے تا بہ گمان مٹھی میں

تو گویا میری فتوحات نامکمل ہیں
کہیں زمین کہیں آسمان مٹھی میں

چلا نہیں ہے دوانوں کا کاروبارِ جنوں
کھلی ہوئی ہے مگر اِک دکان مٹھی میں

کھلی فضاؤں کا جسم کر شکار کھیلے گا
کہ باندھ لی ہے کسی نے مچان مٹھی میں

مقابل آئینہ ہے اور خود سے لڑتے ہیں
کہاں کی فوج، کہاں کی کمان مٹھی میں

تمہارے خوابوں کی لو ہو اگر بلند ظفرؔ
یہ کہکشاں نہ لگے خاکدان مٹھی میں

سانپ کی کینچلی مستقر کیوں لگے
دِل سی انگار وادی بھی گھر کیوں لگے

آبلہ پا ہی کٹنا تھا سارا سفر
تو یہ رستے میں اِتنے شجر کیوں لگے

بے خبر ہو اگر میرے حالات سے
مسکرانا بھی میرا ہنر کیوں لگے

اِتنی دشوار خود آگہی کس لئے
اپنی جانب کو چلنا سفر کیوں لگے

اِس کی موجوں کو کشتی بناتے ہوئے
ہم کو سارا سمندر بھنور کیوں لگے

یونہی خمیازۂ خیرگی نہ پڑے
نہ لگاؤ تو اُس کو نظر کیوں لگے

دِل کی بے رنگی کا عکس چہرے پہ ہے
ورنہ انسان اِتنا کھنڈر کیوں لگے

غیر مانوسیت کے گماں سے پرے
کوئی اپنا ہمیں اِس قدر کیوں لگے

شب کی گمبھیرتا ہمہ آغوش ہے
آ کے تلوار جیسی سحر کیوں لگے

اِن کی پرواز ممنوع ہے تو پھر ظفرؔ
سوچتا ہوں پرندوں کو پر کیوں لگے

زمین و آسماں جو مستقر کا استعارہ ہے
تو کیا یہ بے گھری ہی بام و در کا استعارہ ہے

وہی میں ہوں، وہی تم ہو، وہی دن رات جوں کے توں
سُنا تو تھا سمے اِک چارہ گر کا استعارہ ہے

یہ کس کی دھوپ میں جلتے ہوئے کس کی طرف پہنچے
کوئی تو ہے جو سایۂ شجر کا استعارہ ہے

جو غوّاضِ محبت ہیں وہ اکثر ڈوب جاتے ہیں
یہ ساحل تو حقیقت میں بھنور کا استعارہ ہے

یہ دنیا کیا ہے، اِک بے نام سا گنجل ہے رستوں کا
یہ میری زندگی کیا ہے، سفر کا استعارہ ہے

میں اپنے آپ میں گھلتی ہوئی اِک موم بتی ہوں
مری ہستی کسی بھیگی نظر کا استعارہ ہے

کسی خوشبو کی سرشاری اِسے رُکنے نہیں دیتی
ہوا کے ہاتھ میں میرے ہنر کا استعارہ ہے

تیری آنکھیں فسانوں کا فانوس ہیں
دِل کے کتنے ہی رازوں کی جاسوس ہیں

اِذنِ پرواز ملتا نہیں، کیا کریں
پر کشا ایک مدت سے طاؤس ہیں

کوئی ساعت مری ہمقدم کیا بنے
روز و شب اپنے زنداں میں محبوس ہیں

پھول عنبر فشانی کے قائل نہیں
خودنمائی کے رنگوں میں ملبوس ہیں

یہ بھی چہرہ ہے تیری ہی پہچان کا
تیری بے چہرگی سے بھی مانوس ہیں

لوگ ساحل پہ سہمے ہوئے ہیں سبھی
اور ہم ہیں کہ موجوں پہ محروس ہیں

آسماں بھی بلاتا تھا ہم کو کبھی
اب تو اپنی زمیں سے بھی مایوس ہیں

بس حقیقت ہے اک تیرا سودائے سر
واہمے ہیں جو یہ دشت و قاموس ہیں

کیسی منزل ہے جس کا سفر ہے ظفرؔ
زیرِ پا جتنے رستے ہیں، معکوس ہیں

چاند نکل آیا

تیری میری آنکھوں میں اُمید کا سبزہ لہرایا
دیکھو آج تو دِن میں تارہ چمکا، چاند نکل آیا

پل پل کی ریکھا میں قرنوں کی گمبھیرتا تھی گویا
حائل اپنے رستے میں خود اپنی دنیا تھی گویا
بانگِ سحر دی اور سب کی سوچوں کو سورج پہنایا
دیکھو آج تو دِن میں تارہ چمکا، چاند نکل آیا

خوابوں نے رگڑی ایڑی تو جیسے چشمہ پھوٹ پڑا
دشتِ تمنا میں سارا ساون ہی آ کر ٹوٹ پڑا
صدیوں کی بھولی بسری تاریخ نے خود کو دوھرایا
دیکھو آج تو دِن میں تارہ چمکا، چاند نکل آیا

اِس کی خاک میں پھر پائی اکسیر ہمارے زخموں نے
سر پر ہاتھ دھرا اِس کے افلاک کے گہرے رشتوں نے
خود پر پھر محسوس ہوئی ہے ہم کو ممتا کی چھایا
دیکھو آج تو دِن میں تارہ چمکا، چاند نکل آیا

اپنے رستے میں قالین بچھا کر اپنے جذبوں کا
رنگ بدل کے رکھ دیں گے ہم اپنے سفر کے قصوں کا
اپنا خون پسینہ ہو گا اپنے وطن کا سرمایا
دیکھو آج تو دِن میں تارہ چمکا، چاند نکل آیا

دِل کا سفر ہے اور وہ ہمراہ چل رہے ہیں
سیدھا ہے رستہ جس پر گمراہ چل رہے ہیں

وحشت کی اِک شعاع نے پگھلا دیا ہے پانی
ٹھہرے ہوئے سمندر ناگاہ چل رہے ہیں

ایسا بھی پا پیادوں کا ڈر ہے اِن کو کیسا
اسپ و سپاہ لے کر جو شاہ چل رہے ہیں

اے خامشی صدا دے اِس کائنات بھر میں
منظر کو کر کے ساکت ذی جاہ چل رہے ہیں

اب جانتے ہیں سارے یہ راہِ کربلا ہے
پھر بھی نہتے "لشکر آگاہ" چل رہے ہیں

شہ مات ہوگی ہم کو یا جیت لیں گے بازی
کس کو بساط کی ہے پرواہ، چل رہے ہیں

اسراعِ زیست ہے اور ہر گام پر زمانہ
ڈھوئے ہوئے خسارہ ہم آہ چل رہے ہیں

حرفت کے گلکدوں سے بے رنگیاں سی جھلکیں
یہ لے کے کس پرستاں کی چاہ چل رہے ہیں

نہ سنگِ میل کوئی نہ مرحلوں کی گنتی
منزل کی مل رہی ہے افواہ، چل رہے ہیں

کیا خبر تھی ہو گی اِتنی ساقئ رعنا میں آگ
صورتِ انگار ہے ہر جرعۂ صہبا میں آگ

اِس میں کچھ تو ایسا ہے جو شعلہ آور ہے بہت
خود بخود بھڑکا نہیں کرتی کبھی دریا میں آگ

اُن کے رستے میں جو آتا ہے وہ دہشت گرد ہے
جن ارادوں نے لگا رکھی ہے اِس دنیا میں آگ

راکھ ہو جائیں گے تیرے تاش کے سارے محل
بجھ نہ پائے گی جو بھڑکی دیدۂ بینا میں آگ

اب بجھانے کے جنوں میں پھیلتی ہے اور بھی
وہ کسی جنگل میں ہو یا ہو دلِ تنہا میں آگ

دیکھنا اِس کی تپش جائے گی سارے شہر میں
جب نظر میں آئے گی اِک بھی لبِ گویا میں آگ

جل اُٹھیں ساری شکیبائی کی گیلی لکڑیاں
کیا کہوں کیسی لگی اِس مرتبہ برکھا میں آگ

وقت کی ہمرقص لگتی ہے قلندر کی دھمال
بیخودی نے یوں بھری ہے جسم کے اعضاء میں آگ

یہ دکاں دیکھی ہے ہر موسم میں ہم نے واظفرؔ
تیری یادوں سے خریدیں گے شبِ یلدا میں آگ

شعلگی لُو کی ہے اور موج صبا والی ہے
کیوں گریزاں ہے اگر بوئے وفا والی ہے

یہ تسلی تو مجھے دینی پڑے گی خود کو
دُور یوں ہے کہ وہ مخلوق سما والی ہے

ابرِ آوارہ کی مانند ترے شہر میں ہوں
میری پرواز کسی اور فضا والی ہے

تجھ سے کترا کے گزرنا میرے بس میں تو نہیں
ہر تمنا تو ترے رنگِ قبا والی ہے

"خود" احساس کو پہنا کے چلو آہن کا
خلق بھی اب کے کہاں خوفِ خدا والی ہے

اُس کے جانے کی خبر بھی نہیں ہو پائی تھی
اُس کے آنے کی بھی تاخیر دعا والی ہے

اب مسافت بھی کسی لکۂ بادل کی طرح
ہے تو بے سمت مگر باد نما والی ہے

اِس سے آگے تو کوئی عمر نہیں ہے شائد
ایک ساعت ہے جو گھنگھور گھٹا والی ہے

ہمنوا ہوں گے سبھی زمزمہ پیرانِ چمن
یہ خموشی تو ظفرؔ شورِ نوا والی ہے

ڈھونڈتا پھرتا ہے کس کو لامکاں تک، اب تو رُک
پا چکا ہے تُو غمِ آئندگاں تک، اب تو رُک

کھینچ لے اب تو ذرا زعمِ سفر کی راس کو
سامنے دیوار ہے اِک آسماں تک، اب تو رُک

یونہی اِک کردار کی خاطر بنا ہے گرد باد
ختم ہونے کو ہے تیری داستاں تک، اب تو رُک

اب کوئی بھی نقشِ پا تجھ کو صدا دیتا نہیں
گم ہے آوازِ رحیل کارواں تک، اب تو رُک

ٹھیک ہے، مجھ کو چھڑا لائی ہے قیدِ عمر سے
زندگی! اب لے کے جائے گی کہاں تک، اب تو رُک

تلخیٔ ایّام میں ڈوبے ہوئے ہیں ظرف بھی
اب ہے یادِ مہرباں نامہرباں تک، اب تو رُک

ریت پر چھوڑا ہے یوں بسمل تجھے جس موج نے
لے کے جائے گی وہی آبِ رواں تک، اب تو رُک

آگ برساتے ہوئے سورج کو اہلِ کارواں
مان کر ٹھہرے ہوئے ہیں سائباں تک، اب تو رُک

کیوں کہانی کی ہواؤں میں اُڑا جاتا ہے تُو
دیکھ لے، خاموش ہے معجز بیاں تک، اب تو رُک

(مفعول فاعلات مفاعیل فعلاتن)

وہ لب خموش ہو گئے کچھ بات کرتے کرتے
اُن بادلوں کو کیا ہوا برسات کرتے کرتے

دیکھا تو اپنے گھر کے ہی دیوار و در تھے حائل
پھر سے نئے سفر کی شروعات کرتے کرتے

پوچھو امیرِ شہر سے مورال گر گیا کیوں؟
ہتھیار ڈال بیٹھے فتوحات کرتے کرتے

اے دردِ ہجر تھک گئے دیوانے زندگی کے
اپنے یقیں پہ تیرے مقدمات کرتے کرتے

کیسے بتائیں کتنے قویٰ مضمحل ہوئے ہیں
جینے کی یہ مشقت بھی دِن رات کرتے کرتے

تم لوگ اپنی دھرتی سے آزاد ہو گئے کیا؟
خود کو اسیرِ چشمِ سماوات کرتے کرتے

خود اپنی اگلی سانس سے بھی آشنا نہیں ہیں
ہم گریہ ہائے مرگِ مفاجات کرتے کرتے

حائل رہی ہے وقت کی دیوار درمیاں میں
لاحق رہا ہے ہجر ملاقات کرتے کرتے

اُن پر گزر رہی ہے تو نوحہ کناں ہیں کیسے
کل کھلکھلا رہے تھے مرے ساتھ کرتے کرتے

وقت نے بدلے نہیں ہیں طورِ غم
چپکے چپکے بڑھتا جائے شورِ غم

ڈولتا ہوں میں فضائے عمر میں
کھینچتا ہے ایک لمحہ ڈورِ غم

عشق نے کرنا ہے بائیو میٹرک
دیدہ و دل پر لگا کر پورِ غم

پنکھ پھیلا کر رہے سرمستِ رقص
پاؤں کی جانب نہ دیکھے مورِ غم

انبساطِ وصل کوئی دیر ہے
پھر وہی سسی وہی بھنبھورِ غم

کھینچ کر جیسے ربر کو چھوڑ دیں
دِل اُسی شدت سے جائے اورِ غم

ہر نفس چلتی رہی ہے تیغ سی
زندگی جتنا رہا ہے دورِ غم

چوکیداری دل کی جتنی بھی کریں
وارداتیں ڈال دے گا چورِ غم

تیری آنکھوں کی چمک سے کس قدر چندھیا گئے
اپنی جانب ہونے والے سب سفر چندھیا گئے

یوں کناروں کو معمّوں کی طرح دیکھا تھا کب
اب کے ٹکرانے کو آئے تو بھنور چندھیا گئے

شامیانے چھاؤں کے شاخوں نے جب پھیلا دیئے
اِس قدر اوڑھے پرندوں نے شجر چندھیا گئے

رات کے راہی کو جب دِن کی سہولت مل گئی
دھوپ تھی ایسی کہ اب کے ہمسفر چندھیا گئے

جھٹپٹے میں سائے کو پہچان لیتے تھے مگر
روشنی میں ڈوب کر اہلِ نظر چندھیا گئے

اُس کی بینائی میں بھی خنجر اُتارے عکس نے
مجھ کو اندھا کر کے خود آئینہ گر چندھیا گئے

آزمائش ہو گئی ہے آزمانے والوں کی
یوں ملیں نظریں کہ سورج کے ہنر چندھیا گئے

حادثے ہم کو کبھی پایاب کر پائے نہیں
ذات کے عرفان کو دیکھا تو ڈر چندھیا گئے

وہ جنونِ عشق تو اُمڈا ہوا سیلاب تھا
روکنے والے سبھی دیوار و در چندھیا گئے

ہم

میں تُو یا وہ کچھ بھی نہیں
جب مل کے بن جائیں گے ہم
تو قوم کہلائیں گے ہم

جب تذکرہ دھرتی کا ہو
ذرّوں کی کیا اوقات ہے
جب ذکر ہو ساگر کا تو
موجوں کی پھر کیا بات ہے
زورِ اخوت دیکھ لے
مُکّے کی صورت دیکھ لے
کیسے نظر آئیں گے ہم

صوبوں گروہوں کے یہ بُت
کچھ فیض پہنچاتے نہیں
لاچار سوچوں کے یہ بُت
اِمکان بن پاتے نہیں
بکھرے تو سختی بخت کی
یکجا ہوئے تو وقت کی
تاریخ دوھرائیں گے ہم

سندھی بلوچی بن چکے
کچھ بھی کہاں حاصل ہوا
پشتون و پنجابی رہے
تو بس زیاں حاصل ہوا
سو ایک جب ہو جائیں گے
حیران سب ہو جائیں گے
دنیا پہ چھا جائیں گے ہم

یہ نخلستان دھوکا دشت کا ہے
وگرنہ سارا دریا دشت کا ہے

بڑے رشتے بگولوں کی طرح ہیں
مری دنیا میں نقشہ دشت کا ہے

یہ ریگِ خواب کیوں بکھری ہوئی ہے
تو کیا وہ ایک ٹیلا دشت کا ہے

خزاں کے زنگ سے ہر پل ہے بھاری
کھنڈر ہوں کہ زمانہ دشت کا ہے

نظر آتی ہے ویرانی کھلے سر
مرے گھر میں دریچہ دشت کا ہے

رُتوں کا چوگا بکھرا ہے بہر سو
مگر دِل تو پرندہ دشت کا ہے

توقع اور ہے معجز بیاں سے
سنانے کو فسانہ دشت کا ہے

لہو میں ناچتی ہیں وحشتیں سی
غزالِ جاں ضمیمہ دشت کا ہے

دَھنک کے باد و باراں بھی اکارت
کوئی اندر سے سارا دشت کا ہے

ظفرؔ موسم بہانہ ہے کہ اب کے
گلستاں میں تماشا دشت کا ہے

ایسی بنادی جائے گی حالات کی سرنگ
اک اور شب میں نکلے گی اِس رات کی سرنگ

تم لوگ بات چیت کو کس سمت لے چلے
ہر بات سے نکال کے ہر بات کی سرنگ

انساں حقیر اور وسیع تر ہے کائنات
دونوں کے درمیان فتوحات کی سرنگ

مخزن ہے تیرے خون میں ہر انقلاب کا
اپنی زمیں میں کھود سماوات کی سرنگ

یہ راستے میں کیسی چٹانیں ٹکر گئیں
لے جا رہا تھا تیری طرف ذات کی سرنگ

تا عمر ایک یاد کے آسیب میں رہا
مجھ میں بچھی تھی شہرِ طلسمات کی سرنگ

عقل و خرد کی شعبدہ بازی پہ ہے یقیں
لیکن جو ہر کسی میں ہے جذبات کی سرنگ

کیسے بنائیں ایسی ملاقات کا محل
جس سے بنے اک اور ملاقات کی سرنگ

میں جس کی ظلمتوں میں کہیں کھو کے رہ گیا
کیسے بتاؤں وہ ہے مرے ہاتھ کی سرنگ

لے جائے گی گزار کے ہر دشت و بحر سے
دیکھی نہیں ہے تو نے مناجات کی سرنگ

ہر ظلم میں بچھائی ہے معجز بیان نے
بہرِ قرار روزِ مکافات کی سرنگ

تیرہ شب میں یہ ڈر پل رہا ہے
کوٹھڑی میں دیا جل رہا ہے

چشمِ امروز غمگیں رہی ہے
شام کا اس میں کاجل رہا ہے

مجھ کو گھیرا ہے تنہائیوں نے
اور جنگل میں منگل رہا ہے

حسرتوں کو مری جستجو میں
کس قدر شوقِ گوگل رہا ہے

عمر اک یاد کے در پہ گزری
ٹھہرنے کو یہ ہوٹل رہا ہے

کچھ تو خوئے زمانہ ہے قاتِل
اور کچھ دِل بھی پاگل رہا ہے

فصل پلکوں کی ہے خشک کیسے
میرے اندر تو جلتھل رہا ہے

یوں رہا ہے کوئی زندگی میں
دشت پر جیسے بادل رہا ہے

جس کو رستہ سمجھتا رہا ہوں
کسی پیشانی کا بل رہا ہے

ایک کردار کی چپ میں کھو کر
سارا افسانہ بوجھل رہا ہے

جانِ محفل رہا ہے ظفرؔ بھی
آج تو ذکر بھی کھل رہا ہے

جبر کرنے کو ہے برہم عنقریب
پھٹنے والا ہے کوئی بم عنقریب

بڑھتی جاتی ہیں لہو میں حدّتیں
بھول جاؤں گا میں ماتم عنقریب

حکمتِ عملی ہے، پسپائی نہیں
لے کے وہ نکلے گا پرچم عنقریب

بے ثمر اتنا نہیں دامانِ برگ
جگمگا اٹھے گی شبنم عنقریب

مل چکی ہے اپنے مرنے کی خبر
تعزیت کو آئیں گے ہم عنقریب

تیرے جانے کی طرح رہنا نہیں
تیرے نہ آنے کا بھی غم عنقریب

بے وفا یادوں سے بہلوں کب تلک
میں جلا دوں گا یہ البم عنقریب

اے گل و گلزار کے نوحہ گرو!
جانے والا ہے یہ موسم عنقریب

بڑھ چکی ہے اس قدر سوزش ظفرؔ
زخم ہی لگتا ہے مرہم عنقریب

زندہ ہیں کس دور میں
تن کی اندھی گور میں

بچھڑا تھا اِک آشنا
اور پھر تھا نو مور میں

چُپ ہیں کتنی ساعتیں
گم ہوں کتنے شور میں

پنڈی رہ کر لٹ گیا
سسی کے بھنبھور میں

کیا پانا تھا اور کیا
کھو آیا تُو اور میں

گُنجلائی سب زندگی
اِک لمحے کی ڈور میں

خود ہی چوری ہو گیا
کہنے کو تھا چور میں

سسٹم کے سب قفل ہیں
اُنگلی کی اِک پور میں

بہرے ہوں گے ممتحن
بولا تھا فی الفور میں

خفتہ تھے خنجر کہاں
کرتا کچھ تو غور میں

ترسیں تشنہ کامیاں
پھر ابرِ گھنگھور میں

پاکستان کی خاطر

(۳ اپریل ۲۰۲۴ء الیکشن کے لئے ایک گیت)

لوگو! آج ملا ہے موقع!!
لہر اُٹھی ہے کر گزرو تم
جو ٹھانی ہے، کر گزرو تم
وقت یہی ہے کر گزرو تم
اُٹھو پاکستان کی خاطر
جاگو پاکستان کی خاطر

مایوسی حالات سے کیسی؟؟
اب تو اپنی قوت جانو!
اپنے آپ سے بھی بیگانو!
اپنے دشمن کو پہچانو!
بولو پاکستان کی خاطر
جاگو پاکستان کی خاطر

دیکھو اپنے چاروں جانب
دے رکھے ہیں تمہیں خدا نے
دنیا بھر کے سبھی خزانے
اپنی قسمت آپ بنانے
نکلو پاکستان کی خاطر
جاگو پاکستان کی خاطر

کب تک گروی پڑی رہیں گی
خودداری کی یہ جاگیریں
خود بدلو اپنی تقدیریں
پاؤں کی یہ سب زنجیریں
توڑو پاکستان کی خاطر
جاگو پاکستان کی خاطر

ذوقِ نظر نے ایسا الجھا دیا نظر کو
جلوے نے آپ بڑھ کے بوسہ دیا نظر کو

اب رات آ کے جیسے غرفے میں جم گئی ہو
اب چاند نے نکل کے گہنا دیا نظر کو

اِک پل کی گمرہی بھی نگھلے مرا سفر کیوں
بسکہ ملا ہوا ہے دِل سا دیا نظر کو

بس دیکھنے ہی والے پر کیوں حدیں لگی ہیں
اُس کو بھی دوش، جس نے بھٹکا دیا نظر کو

میں دیکھتا تھا، اُس کو رستہ نگھل رہا تھا
اُس نے یوں مڑ کے دیکھا پتھرا دیا نظر کو

میں راستے کے گنجل میں رہ گیا اُلجھ کے
اندھی مسافتوں نے بھٹکا دیا نظر کو

ہر لمحے نے تراشے رنگوں کے عکس کیا کیا
دنیا کے کینوس پر بکھرا دیا نظر کو

کیسا غنی تھا ظرفِ نظارہ بھی ہمارا
اک لامکاں کا منظر پہنا دیا نظر کو

اب دیکھ کر کسی کو زندہ نہ ہو سکے گی
یادوں کے مقبرے میں دفنا دیا نظر کو

تُو زندگی تھا، تجھ کو بسر کر چکا ہوں میں
عمرِ رواں سے کب کا سفر کر چکا ہوں میں

بے فیض گونجا گنبدِ بے در میں عمر بھر
اب خامشی کو اپنا ہنر کر چکا ہوں میں

سورج اِسی کلس سے جو نکلے تو بات ہے
ظلمت کدے پہ رنگِ سحر کر چکا ہوں میں

دِل کو سرابِ عشق میں چھوڑ آیا ہوں کہیں
اِس لو کو بھی چراغ بدر کر چکا ہوں میں

منظر کی اِس بساط کو لے جا لپیٹ کے
اب اپنی سمت اپنی نظر کر چکا ہوں میں

اب تک بلیک ہول کی گھاتیں ہیں کس لئے
وہ جو اِدھر تھا اُس کو اُدھر کر چکا ہوں میں

تو کیا وہ بدلہ لینے کو آتا ہے دھیان میں
تو کیا کسی کے دھیان میں گھر کر چکا ہوں میں

اِک دیو بن گیا ہوں میں بھوتوں کے سامنے
اب قتل اپنے دور کا ڈر کر چکا ہوں میں

میری غزل ہے اُس کا مکمل پتہ ظفرؔ
اُس بے خبر کی سب کو خبر کر چکا ہوں میں

ڈوب کر بھی کوئی وحدت میں ہوا نہ گم سم
کوئی پا کر غمِ ہجراں کا خزانہ گم سم

سارے پتھرائے کسی ہوشربا جادو سے
تیری محفل میں کہاں میں ہی یگانہ گم سم

ہوش والے کسی نادانی کی حسرت میں ہیں
تیر کی زد میں نہ آ کر ہے نشانہ گم سم

کس نشے میں تھا سمے، ایک قدم بھی نہ چلا
خود کو دوھراتا رہا کوئی زمانہ گم سم

زاویئے اِتنے بھلا کس کے بنے تھے پہلے
عکس دیکھے تو ہوا آئینہ خانہ گم سم

کل کلاں کون جدائی کا سفر کاٹے گا
ہو گیا کر کے مسافر کو روانہ گم سم

ہر قدم عشق کا، اسرار کی دلدل میں ہے
دھند میں غار کا ہو جیسے دھانہ گم سم

گیت کو ایسی حقیقت نے ہتھیلی میں بھرا
حرف کے چاک پہ اب بھی ہے ترانہ گم سم

کسی غرفے سے ہوا ایسا کوئی جلوہ طلوع
دیکھ کر شب کا ہے سارا ہی گھرانہ گم سم

تیری زر دوش اناؤں پہ مقدمہ کیسا؟
تیرا شاعر تو مزاجاً ہے پرانا گم سم

میں نے کھویا نہ وہاں پر بھی شعورِ ہستی
ہر اکائی تھی جہاں خانہ بہ خانہ گم سم

ڈھونڈنے والوں کو کس دنیا میں مل پائے گا
بیخودی کے کسی عالم میں دوانہ گم سم

یہ گلی ہے کہ کئی صدیوں کا پاتال ظفرؔ
آمنے سامنے کے گھر کا فسانہ گم سم

جہاں جینے کا ساماں تھا وہاں مرتا ہوا پہنچا
میں ہر لمحے میں صدیوں کا سفر کرتا ہوا پہنچا

پہنچنا تھا جہاں پر جیت کر لاکھوں کے لشکر سے
بالآخر میں وہیں پہنچا مگر ہرتا ہوا پہنچا

خرد والوں کی منزل راستوں کا ایک گنجل تھی
میں پاؤں پل صراطِ دل پہ ہی دھرتا ہوا پہنچا

بہادر ہوں یا بز دل معرکے کے بعد طے ہو گا
کہ اپنے ڈر سے لڑنے کے لئے ڈرتا ہوا پہنچا

مجھے کیوں زیست سے عہدہ براہونا نہیں آیا
فنا کے اصطبل تک آگہی چرتا ہوا پہنچا

خود اپنا سامنا کرنے کو پہنچا آئینہ خانے
مگر کتنے ہی خوابوں کو لہو کرتا ہوا پہنچا

مجھے منوانا تھا خود کو جہانِ ناسپاساں میں
ظفرؔ جرمانہ اپنے ہونے کا بھرتا ہوا پہنچا

کششِ ثقل کو سدھالیں ہم
آسماں کو قدم بڑھالیں ہم

خود کو غرقاب ہی نہ کربیٹھیں
اِتنے اوہام تو نہ پالیں ہم

کاش خاموشی کی گرامر بھی
اپنے احساس کو پڑھالیں ہم

غافلوں میں مقیم ہیں کب سے
جاگنے والوں کو جگا لیں ہم

رات اِتنی بسیط بھی نہ رہے
کچھ ستارے اگر اچھالیں ہم

ہر حقیقت سے دو دو ہاتھ کریں
کیوں ملا کر نظر چرا لیں ہم

اپنے نقشِ قدم سے لوٹ چلیں
اِن دواخانوں سے دوا لیں ہم

زندگی سے نکل گئے ہیں تو پھر
اُن کو دل سے بھی تو نکالیں ہم

تجربے کر رہے ہیں اپنے بیان
دے رہے ہیں تری مثالیں ہم

جو سنی اَن سنی کیے رکھی
دوسروں کو وہی بتا لیں ہم

وہ جو پیچھے ہیں، اُن کو لے کے اُڑیں
وہ جو آگے ہیں، اُن کو جا لیں ہم

دِل کو یوں تیرے غم کے ثوابوں کا شوق ہو
ریگِ رواں کو جیسے سحابوں کا شوق ہو

آساں رہا ہے عشق کا اندھا سفر کہاں
یہ وہ کریں کہ جن کو عذابوں کا شوق ہو

محمل نشین پہ کیسے کھلے سرِّ جستجو
دشتِ وفا میں نکلے، سرابوں کا شوق ہو

غرقاب ہوں نہ دیدۂ ساقی میں ڈوب کر
رِندوں کو ہر طرح کی شرابوں کا شوق ہو

اِن آئینوں میں عکس تراشیں حیات کا
میری طرح سے سب کو کتابوں کا شوق ہو

تقدیر میں ہے کور نگاہی کا روزگار
آنکھیں ملیں تو ہم کو بھی خوابوں کا شوق ہو

ہر زور و زر کے دیو کو رکھیں حدود میں
دِل والوں کو سوالوں جوابوں کا شوق ہو

اب روشنی کا دائرہ اُن پر بھی کہ جنہیں
اسٹیج پر بھی آ کے نقابوں کا شوق ہو

لازم نہیں کہ اُن کے کھلونے بنے رہیں
درپے ہمارے عالی جنابوں کا شوق ہو

سب کے وجود چاند ستارے بنے رہیں
ظلمت میں روشنی کے نصابوں کا شوق ہو

احساس کا جمال ہے پیشِ نظر ظفرؔ
بھنورے نہیں کہ ہم کو گلابوں کا شوق ہو

دِل اُگا آئیں، جگر بو آئیں
جہاں جائیں وہیں گھر بو آئیں

نہ رہے سمت کوئی نامعلوم
سارے رستوں پہ سفر بو آئیں

ڈگمگانے لگے ایمانِ شب
اِس قدر خوابِ سحر بو آئیں

دُھوپ کے شہر سے ایسے گزریں
جا بجا آپ شجر بو آئیں

اپنے ہونے کا نمو باقی رہے
ایسے منظر میں نظر بو آئیں

زخمِ دل صورتِ فصلِ گل ہو
مسکرانے کا ہنر بو آئیں

پائیں نہ پائیں کسی دِل کی دھنک
جاں سرِ راہگزر بو آئیں

نام لکھا ہے جہاں اوروں کا
اُن صلیبوں پہ بھی سر بو آئیں

کیسے ساحل کا ثمر پائیں گے
جو سمندر میں بھنور بو آئیں

کشتِ احساس تو بنجر نہ رہے
ہم اگر خود کو ظفؔر بو آئیں

دنیا کے ہاتھ تیرے لگانے میں لگ گئے
تُو نے لگا دیا تو کمانے میں لگ گئے

تیری گلی سے آگے کٹھن رہگذار تھا
ہم ہر جگہ سے خود کو بچانے میں لگ گئے

جن کو تمہارے ساتھ گزارا نہ جا سکا
وہ پل بھی زندگی کے خزانے میں لگ گئے

جس سے گزارنا تھا کسی خواب نے مجھے
آئینے اُس سمے کے دھانے میں لگ گئے

ہم دنیا کے خداؤں کے ہاتھوں زمیں بدر
خود اپنی کائنات بنانے میں لگ گئے

ترکش کا ہی شعورِ ہدف ڈگمگا گیا
ہم تیر بن کے آپ نشانے میں لگ گئے

ذوقِ جمال اُن کا نکھارا، خطا ہوئی
میرے چمن کے پھول چرانے میں لگ گئے

فطرت نے جو دیا وہ رُتوں کو تھما دیا
خوشبو بہانے، رنگ اُڑانے میں لگ گئے

سیڑھی جو آسمان سے دِل کی لگائی ہے
آ آ کے لوگ اُس سے گرانے میں لگ گئے

کتنی نگاہیں راستہ تکتی تھیں اور ہم
سارے کے سارے ایک فسانے میں لگ گئے

تجھ سے رُوٹھا تو میں تیری دنیا سے ہی چلا گیا
پر تیری ناراضی دیکھی، دنیا سے ہی چلا گیا

اُس سے مل کر مجھ کو اِس دنیا میں رہنا آیا تھا
اور وہ ایسی اچھی خاصی دنیا سے ہی چلا گیا

وقت کی مٹی لے کر جس نے جیون گوندھا مرضی کا
دیکھو دیکھو آج تو وہ بھی دنیا سے ہی چلا گیا

قطرہ قطرہ زہر غموں کا پینا تو آسان نہیں
آخر کب تک جیتا روگی دنیا سے ہی چلا گیا

باندھ کے بیٹھا تھا جو اِک مدت سے اپنا رَختِ سفر
آج پکڑ لی کوئی سواری دنیا سے ہی چلا گیا

برسوں میں صدیوں کا جیون جی کر بھی افسوس رہا
لایا تھا کیا عمر ذرا سی دنیا سے ہی چلا گیا

کیا کیا جتن کیئے تھے اُس نے لیک بنا نہ پایا گھر
از خود جائے قبر ملی تھی دنیا سے ہی چلا گیا

داناؤں نے اُس کی خاطر ونڈر لینڈ بنائے تھے
توبہ کیا بد بخت تھا، ایسی دنیا سے ہی چلا گیا

حیرت کے رنگین سفر سے لوٹ کے آنا بھول گیا
کچھ دیکھی اور کچھ اَن دیکھی دنیا سے ہی چلا گیا

دنیا والوں نے تو جینا دوبھر کر رکھا تھا ظفرؔ
باہیں پھیلائے تھی دھرتی، دنیا سے ہی چلا گیا

ارادے مجتمع کر، سلسلہ مکمل کر
سفر ضروری ہے تو قافلہ مکمل کر

قطع نہ کر غمِ ہجراں سے ہر دسمبر کو
کسی برس تو کوئی دائرہ مکمل کر

نہیں قیاس کسی زاویے کا صورت گر
بساطِ عکس بچھا، آئینہ مکمل کر

کوئی سفر کسی لاحاصلی پہ ختم نہ ہو
قدم اٹھا کے ہر اک راستہ مکمل کر

محبتوں میں مناسب نہیں وصال کی ضد
غمِ حیات سے ہی ذائقہ مکمل کر

اب اپنی کم نظری کو بھی اپنی شست میں باندھ
کمی رہے نہ کوئی، مورچہ مکمل کر

بچھا دیے ہیں حوادث نے تنکے بہرِ بناء
عطا سمجھ کے اسے گھونسلہ مکمل کر

وطن پرستوں پہ آیا ہے اجتماعی عذاب
سو اپنے خواب ملا، سانحہ مکمل کر

جشنِ آزادی
مبارک

اپنی آزادی ہے جاں سے بھی عزیز
اِس سے بڑھ کر کون سی دنیا میں چیز
حقِ بنیادی مبارک آپ کو
جشنِ آزادی مبارک آپ کو

آزمائش کے سمے آتے رہے
سرخرو ہو کر سبھی جاتے رہے
عزمِ فولادی مبارک آپ کو
جشنِ آزادی مبارک آپ کو

کٹ مرے جو اُس کے رستے میں شہید
جو ہیں غازی اِرتقاء کی ہیں کلید
وقتِ دلشادی مبارک آپ کو
جشنِ آزادی مبارک آپ کو

غیر کا اِس قوم پر دستور ہو
غیرتِ ملّی کو کیوں منظور ہو
جذبِ افرادی مبارک آپ کو
جشنِ آزادی مبارک آپ کو

ہجر کے ہر لمحے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں
یادوں کے قبضے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

تُو نہ ہو تو تیری بھیڑ سی لگ جاتی ہے ہر سو
ہر اچھے چہرے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

بڑھتے گھٹتے جلووَں کی ہر جھلمل تجھ سے ہے
چاند کے ہر مکھڑے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

میرے دِل میں بستا ہے یا آپ ہی میرا دِل ہے
دَھڑکن کے خرچے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

لوگوں میں تقسیم ہوئے ہیں کیا کیا ہیرے موتی
اور اپنے حصے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

چھین کے لے آتا ہوں ظالم ظالم قرنوں سے
دیکھ لے کس زمرے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

تھام رکھا ہو جیسے ہاتھ بساطِ ہستی پر
شطرنج کے مہرے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

ہر گل رو میں تیرے حسن کا پرتو ہے کوئی
اور اِس جمگھٹے میں تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

گردِ سفر میں کھو کر گو میں خود بے چہرہ ہوں
کیانی ایسے میں بھی تیرا چہرہ دیکھتا ہوں میں

کیسے ہو تاراج بدروحوں سے گلزارِ پرند
پار کرنا ہو گی پہلے اِن کو دیوارِ پرند

کاٹ لیں بے شک کلہاڑے پھر درختوں کے تنے
کاٹنے پائیں اگر پہلے یہ پندارِ پرند

ظالموں سے ہو گا پھر ایک ایک گولی کا حساب
دیکھنا اِک روز لگ جائے گا دربارِ پرند

کوئی بھی سمجھا نہیں اِس زمزمہ پیرا کو کیا؟
ہر شجر سے پوچھ دیکھا ہم نے آزارِ پرند

کتنی صدیوں کی کہانی ہے مری تصویر میں
کینوس کی سبزگی ہے اور انوارِ پرند

اِن سے ہی ہر رُت میں دیکھے زندگی کے پیچھے
ہو جہاں سبزہ، وہیں ہوتے ہیں آثارِ پرند

ایسے اپنے آشیانے چھوڑ کر جاتا ہے کون
کیسے ہجرت کے عذابوں میں ہے ہر ڈارِ پرند

رکھ دیا ہے روند کر اِس نے غرورِ ابرہہ
سرمدی سی مسکراہٹ تو ہے یلغارِ پرند

بس خزاں کے جبر تک ویرانئ دِل ہے ظفرؔ
فصلِ گل میں گرم ہو جائے گا بازارِ پرند

اپنی بربادی پہ کیوں سب سے جلے بیٹھے ہیں
ہم کہ خود اپنی ہی صحبت میں اُٹھے بیٹھے ہیں

اِن کو اِک لمحے کا بم چاہیئے پھٹ پڑنے کو
کتنے طوفان مری چپ سے لگے بیٹھے ہیں

کیوں سمجھتے ہیں کہ دہشت سے زمانہ شل ہے
یہ پٹاخے جو بڑی دیر چلے بیٹھے ہیں

معجزے ہوتے نہیں زعمِ مسیحائی سے
لوگ زخموں کو یونہی کر کے ہرے بیٹھے ہیں

پھول خود اپنی تمازت سے نمو پائے ہوئے
چرمرائی ہوئی شاخوں پہ کھلے بیٹھے ہیں

اپنے ہی گھر میں اِنہیں بے گھری کا سامنا ہے
جو پرندے کسی ہجرت پہ تُلے بیٹھے ہیں

ہم کو احساس کی سولی پہ چڑھانے والے
آپ بے چہرہ ہیں، آئینے لئے بیٹھے ہیں

اُن کو مستور نہ کر پائے حیا کے گھونگٹ
سارے منظر میں دھنک بن کے سجے بیٹھے ہیں

ساقیا اپنے تغافل کی منا خیر کہ اب
جام خالی ہیں مگر رِند بھرے بیٹھے ہیں

وہ ہم سے مل کے ہماری ہی سوچ میں گم تھیں
مصافحے کی اضافی دبوچ میں گم تھیں

میں سُن رہا تھا مگر سُن رہا تھا کیا جانے
سماعتیں تیرے لہجے کی لوچ میں گم تھیں

میں اُن کے حسن کے حیرت کدے میں کھویا تھا
جو اُس سمے میرے پاؤں کی موچ میں گم تھیں

ستارے جھک کے فلک سے پکارتے تھے مگر
تری امنگیں کسی ہیچ و پوچ میں گم تھیں

وہ جا چکا تھا مراسم کو توڑ کر کب کا
نگاہیں دُور، بہت دُور کوچ میں گم تھیں

سرودِ شام سے مسحور تھیں فضائیں کہاں
کڑکتی برق کی گالم گلوچ میں گم تھیں

پرانے لوگ نئے خول میں بھی ننگے تھے
کہ نیتیں تو اُسی نوچ و کھوچ میں گم تھیں

ٹٹولتے تھے اُنہیں گھر میں رشتے آئے ہوئے
وہ لڑکیاں جو دِلوں کے بلوچ میں گم تھیں

کسی کے حسن کا قصہ بیان کرتے ہوئے
ہماری غزلیں کسی اور سوچ میں گم تھیں

یاد بھی رنگِ صبا رکھتی ہے
زخم پھولوں سا کھلا رکھتی ہے

خواب مرنے نہیں دیتے مجھ کو
رات بھر نیند جگا رکھتی ہے

جب صداؤں کا دیا بجھتا ہے
خامشی حشر بپا رکھتی ہے

لوگ مر کر بھی نہیں مر پاتے
زندگی در جو کھلا رکھتی ہے

بسکہ کھونے نہیں پاتا خود کو
گمرہی تیرا پتہ رکھتی ہے

وہ خداؤں کی گرج سے نہ دبی
جو نوا خلقِ خدا رکھتی ہے

تیری عریانی سبھی دیکھتے ہیں
کس تحیر کی قبا رکھتی ہے

چارہ سازئ زماں کیا چاہے
جب وفا دستِ دعا رکھتی ہے

کتنے طوفاں میں گھری راہ ابھی
ایک نقشِ کفِ پا رکھتی ہے

فلک کے پیڑ سے لائیں گے توڑ کر تارے
بنیں گے خوابِ سحر گاہی کے ثمر تارے

اِسی لئے تو مرا ملک ہے اندھیروں میں
کہ رُلتے پھرتے ہیں گلیوں میں بیشتر تارے

سجاتا مانگ اُنہی سے میں اندھی گلیوں کی
اُترتے ہوتے مرے صحن میں اگر تارے

میں اُن سے اپنے مقدر کا حال کیا پوچھوں
کہ اپنے آپ سے پھرتے ہیں بے خبر تارے

اِسی لئے کئی راتوں سے سو نہیں پایا
تمہاری باتیں کریں مجھ سے رات بھر تارے

بھٹکنے دیتے نہیں زندگی کے جنگل میں
ہمیشہ ساتھ رہیں میرے ہمسفر تارے

نجانے کتنے ہی برسوں سے پھرتے آئے ہیں
ہمارے خوابوں کو لے کر اِدھر اُدھر تارے

نکال لایا ہو جیسے سرنگ سے کوئی
دکھائی دیتے ہیں اب تو نگر نگر تارے

یہ آسماں کے پرندوں کو جستجو کیا ہے
ازل سے دیکھے گئے ہیں اُڑان پر تارے

اِنہی سے ظلمتِ شب کی سیاہی مٹتی ہے
ہماری آنکھ کے آنسو بھی ہیں ظفرؔ تارے

دیکھ کے میرے بال و پر میں پروازوں کا دھوکا سا
ہر انجام سے پھوٹا پھر سے آغازوں کا دھوکا سا

اُمیدوں نے خود سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑنا ہے
دیواروں نے پہن لیا ہے دروازوں کا دھوکا سا

جانے آگاہی نے کس نمبر کی عینک پہنی ہے
ہر قاتل پر کیوں ہوتا ہے دمسازوں کا دھوکا سا

ہر رشتے نے میری آشاؤں پر سنگ زنی کی ہے
سب سمتوں میں لے کے گیا ہے اندازوں کا دھوکا سا

مخمل ہے یا دام بچھایا ہے رنگین سرابوں کا
وحشت کا خمیازہ ہے یا خمیازوں کا دھوکا سا

خوابوں نے یہ ہم میں کیسی درزیں ڈال دیں چپکے سے
قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے کن رازوں کا دھوکا سا

کہنے کو موجود نہیں تُم پھر بھی ہر سو گونجتا ہو
محفل کا ہنگامہ لگتا ہے سازوں کا دھوکا سا

سورج کی ہے شفق بشارت یا آسیب گمانوں کا
کس افسانے کی سرخی ہے یہ غازوں کا دھوکا سا

ہم نے خود میں اِس کی پنیری آپ لگائی ہے کیا نئی
جو سنّاٹا بانٹ رہا ہے آوازوں کا دھوکا سا

ظلمت میں کب تنہا سا ہے چاند یہاں
ہر جگنو اِک چھوٹا سا ہے چاند یہاں

اِس کی کرنیں اِس کا رنگ جماتی ہیں
چُپ رہ کر بھی گویا سا ہے چاند یہاں

مبہم مبہم ابلاغِ تنویر ہے کچھ
ابر میں کھویا کھویا سا ہے چاند یہاں

ہر ممتا کا فتویٰ ہے یہ ازلوں سے
ہر بچہ اِک اُجلا سا ہے چاند یہاں

جادۂ تاریک میں رُلتا پھرتا ہوں
کیسا میرا اپنا سا ہے چاند یہاں

جھیل میں اُترا آپ فرازِ گردوں سے
آخر اِتنا کیوں پیاسا ہے چاند یہاں

تیرہ تیرہ گلیوں کا ہے جسم جلا
جس سے چمکا دمکا سا ہے چاند یہاں

ہم تو یہ بھی سوچ کے چلتے رہتے ہیں
ساتھ ہمارے چلتا سا ہے چاند یہاں

جبر او ہام ہے، اب اہلِ یقیں بول پڑیں
ہم نہ بولے تو حوادث نہ کہیں بول پڑیں

کھٹکھٹاؤں کوئی در اپنی انا کو تج کے
اور آگے سے شکن ہائے جبیں بول پڑیں

کہیں پتھرا کے نہ رکھ دیں یہ طلسماتِ فضا
ایسی چپ ہو تو یہ بہتر ہے ہمیں بول پڑیں

کچھ سوالات کی ضربوں سے ہی زنجیر کٹے
جب مقفل ہوں مکاں سارے مکیں بول پڑیں

جاں کو آنے لگی بدصورتی سناٹے کی
کاش اِس شہر کے سارے ہی حسیں بول پڑیں

مصلحت اُنگلی نہ رکھ دے لبِ بیساختہ پہ
ہم کو منظور نہیں ہے تو "نہیں" بول پڑیں

خود کو جب کرنے لگوں قائل دردِ ہجراں
دُور کے لوگ مرے دِل کے قریں بول پڑیں

سارا ساحل ہی نہ لے جائے کوئی موجِ بلا
آسماں ٹوٹے تو سب خاک نشیں بول پڑیں

بے حسی شہر کی پہچان نہ بن جائے ظفرؔ
بولنے والے جہاں بھی ہوں وہیں بول پڑیں

خود اپنے ہاتھوں ہوں مطعون، دوسرا تو نہیں
اِس اندرون کا بیرون دوسرا تو نہیں

ترے خیال سے بھر دی ہے کائنات کی شیلف
حیات میں کوئی مضمون دوسرا تو نہیں

ہر ایک تن میں اِسی درد کی روانی ہے
تری رگوں میں کوئی خون دوسرا تو نہیں

ہماری نظروں نے آنا ہے گھوم پھر کے یہیں
تمھارے جلوے سا مسکون دوسرا تو نہیں

میں دوسروں کی طرح ہو گیا ہوں خاکستر
غمِ حیات ہے، طاعون دوسرا تو نہیں

یہ آئینہ بھی ہوں میں اور سارے عکس بھی میں
جو مجھ میں مجھ سے بھی ہے دُون دوسرا تو نہیں

ہمارے عشق کا انجام ہو گا اوروں سا
ہمارے واسطے قانون دوسرا تو نہیں

ہم اپنے آپ کو کیوں اجنبی سے لگتے ہیں
ہماری قبر میں مدفون دوسرا تو نہیں

غمِ حیات تو اب بھی بڑا ساز نداں ہے
ترے ظفرؔ کا بھی رنگون دوسرا تو نہیں

عجب ہوں سائیکوسپنوں کی سخت کوشی میں
کہ جرمِ عشق پہ کرتا ہوں ناز (دوشی میں)
ستارہ بار رہی کائنات آنکھوں کی
کٹی ہے شب تیری یادوں کی تاج پوشی میں
تمام عمر بدن کے قفس میں قید رہا
پہ جنسِ زیست ملی دامِ سرفروشی میں
خرد کے ساتھ بہت دُور تک نہ جا پایا
بہک گیا کسی جذبے کی بادہ نوشی میں
میں اِتنا ہوگیا مغلوب جشنِ وحشت سے
کہ خود کو مار دیا آپ گرمجوشی میں
برونِ ذات ہوا ہوں جو خیمہ زن اب کے
خدا سے ملنے لگا ہوں میں "راکا پوشی" میں
ظفرؔ نہیں یہ زمانہ ہی گوش بر آواز
میں چیختا تو ہوں پیرایۂ خموشی میں

کوئی مسئلہ بنوں تو کسی امتحاں پہ پہنچوں
ملے عشق کا افادہ تو غمِ ذیاں پہ پہنچوں

مجھے پر جو لے اُڑے ہوں، مری خاک سے بنے ہوں
میں اِسی زمیں کے رستے ترے آسماں پہ پہنچوں

تُو مجھے شکار کر لے تو بنوں ہدف خوشی سے
تُو مری نظر میں اُترے، میں تری دکاں پہ پہنچوں

کبھی وحشتوں کا صحرا، کبھی دہشتوں کا جنگل
یونہی چلتے چلتے اِک دن رہِ کہکشاں پہ پہنچوں

تری روشنی لکیرے، یہ خطوطِ دست میرے
میں کہاں کہاں سے گزروں، میں کہاں کہاں پہ پہنچوں

من و تُو کا کیا ہے قصہ، تُو مرا، میں تیرا حصّہ
نہ کسی یقیں سے اُلجھوں، نہ کسی گماں پہ پہنچوں

یہ ہے حسرتِ زمانہ تو رہے گا اک فسانہ
تُو مری زبان پکڑے تو ترے بیاں پہ پہنچوں

مری ضربتِ جنوں سے یہ حصارِ خوف ٹوٹے
جو نہ تیر بن کے سوچوں تو بھلا کماں پہ پہنچوں؟

غمِ جاں سے پاؤں فرصت تو جہاں کی آئے نوبت
یہ درِ مکاں کھلے تو کہیں لامکاں پہ پہنچوں

ہجر ہے اور فردا میں بل کھاتا اِس کا خوف ہے
ہائے کیا تنہائی ہے اور کیسا اِس کا خوف ہے

زیست میں کیسا سکوں ہے، اِتنے ہنگاموں کے بعد
زلزلے سے پہلے سناٹے سا اِس کا خوف ہے

جانے والے دور سے تو سرخرو ہو نہ سکے
آنے والے دور میں کیا ہوگا، اِس کا خوف ہے

ذات ہے اوہام کی بوسیدگی پہنے ہوئے
اور ہر اک دزد میں سے رِستا اِس کا خوف ہے

وقت کے پُرہول جنگل کا مسافر ہے یہ دِل
زندگی بھر ساتھ چلنے والا اِس کا خوف ہے

یہ جو بدروحوں سا ہے پودا، ترے ہاتھوں کا ہے
سائے میں ہونا تھا لیکن اُلٹا اِس کا خوف ہے

ڈر رہا ہے وہ بھی یہ بھی سامری کے سحر سے
ڈرنے والوں کو یہ کیسا اُس کا اِس کا اِس کا خوف ہے

ڈرنے والوں کے لئے خود اُس کا سایہ ہے بہت
دھڑکنوں کے زیر و بم میں اُترا اِس کا خوف ہے

اِک ذرا اپنے دیئے کی لو پہ بھی ایمان رکھ!
تیرگی اِتنی نہیں ہے جتنا اِس کا خوف ہے

دیکھتا رہتا ہوں مسجودِ ملائک کو ظفرؔ
کتنا مہنگا شخص، کتنا سستا اِس کا خوف ہے

جو غمِ دستار میں پڑتا نہیں
گرمیٔ بازار میں پڑتا نہیں

رَن میں اُتروں تھام کے سر کا علم
اندک و بسیار میں پڑتا نہیں

اِس پہ غراتا ہے طوفانِ بلا
کیوں بھنور پندار میں پڑتا نہیں

آبلہ پائی بھی ہے خلعت مجھے
راستہ دربار میں پڑتا نہیں

عشق میں گھاؤ بنا لے زیست کو
یوں کوئی آزار میں پڑتا نہیں

گرد جس منظر پہ ہو تشکیک کی
دیدۂ بیدار میں پڑتا نہیں

اب تو دنیائے خبر کا سایہ بھی
سرخیٔ اخبار میں پڑتا نہیں

میں کما لیتا خساروں سے نفع
کاہے کاروبار میں پڑتا نہیں

یہ ریاضِ زندگی کس کام کا
در ہی جب دیوار میں پڑتا نہیں

مجھ پہ در کھلتے نہیں الفاظ کے
خود میں جب اشعار میں پڑتا نہیں

وقت کی اسفنج سے نچڑی ہوئی ہے یاد پھر
اپنے پہلو میں تجھے پاتا ہوں تیرے بعد پھر

کیسا ایٹم بم گرایا ہے تمہارے ہجر نے
مسکراہٹ اِن لبوں پر نہ ہوئی آباد پھر

زیست آئے دن کے محشر سے فنا ہوتی نہیں
اِس خرابے سے اُٹھے گی خود بخود بنیاد پھر

ریگِ صحرا سے بھرے ہیں بام و در احساس کے
نقشۂ ہستی میں شہرِ دل ہے نا آباد پھر

جب گلے لگنے لگوں میں لمحۂ موجود کے
دہاڑنے لگتے ہیں میرے خون میں اجداد پھر

اِتنے خانوں میں مجھے بانٹا ہوا ہے زیست نے
اِن کو گننے سے بھی عاجز ہو گئے اعداد پھر

جانتا ہوں میں سفر سے لوٹ کر آتے ہوئے
منتظر کوئی نہ کوئی گھر میں ہے اُفتاد پھر

ناسپاسی کا گلہ کیا ہو سرِ بزمِ سکوں
حادثے بیٹھے ہوئے ہیں آکے بہرِ داد پھر

حوصلہ پا چکتا ہوں تو دیکھتا کیا ہوں ظفرؔ
رُکتے رُکتے بڑھ گئی ہے ظلم کی میعاد پھر

دیوانہ ہر اِک خواب کی تعبیر بھی چاہے
ریکھاؤں میں آشاؤں کی تحریر بھی چاہے

میں وقت کا سکہ ہوں، اگر چل نہیں پایا
پھر جیب میں رکھ لے مجھے تقدیر بھی چاہے

ویسے تجھے پانے کی ہے عجلت مرے دِل کو
تُو چاہے تو اِک عمر کی تاخیر بھی چاہے

سمٹی نہیں جاتی جو فریمِ دل و جاں میں
ہر رُوپ میں ناداں وہی تصویر بھی چاہے

پُل اب کے بنانے ہیں میانِ دلاں ہم نے
مسمار کرو حسرتِ تعمیر بھی چاہے

چل دُوں تو رکاوٹ کوئی خاطر میں نہ لاؤں
پڑ جائے ترے نام کی زنجیر بھی چاہے

ہوتا ہی نہیں ختم تذبذب کسی صورت
سُن لے لبِ ناگفتہ کی تقریر بھی چاہے

ہم نے تو جلانا ہے دیا تیرہ شبی میں
ہو انجم و مہتاب کی تنویر بھی چاہے

ہو گا وہی صحرا، وہی مجنوں، وہی وحشت
محمل کی عطا کیجئے جاگیر بھی چاہے

خود کو اوہام کی دلدل سے نکالیں صاحب!
خوف بارودی سرنگیں نہ بچھالیں صاحب!

اِتنے بیدار تو ہوں خوابِ گراں سے اُٹھ کر
آپ چڑھتے ہوئے سورج کو ہی جالیں صاحب!

کھو نہ جائیں کہیں افلاک کو جاتے جاتے
راستہ اپنی طرف کو بھی نکالیں صاحب!

اِتنی بے چہرگی اچھی نہیں تنہائی کی
کچھ تعلق کے بھی رنگوں میں نہالیں صاحب!

ہاتھ پاؤں تو یوں ہمت سے بھی بڑھ کر مارے
آ گیا وقتِ دعا، ہاتھ اُٹھا لیں صاحب!

کام میں لائیں پس انداز توانائی کو
کبھی ٹھہرے ہوئے پانی کو چلا لیں صاحب!

گردِ دنیا تو بہت منہ پہ ملے بیٹھے ہیں
اب ذرا درد کی دولت ہی کما لیں صاحب

دیکھتی رہتی ہیں حسرت بھری آنکھیں، دیکھیں!
اِک نظر تو مرے کشکول میں ڈالیں صاحب!

یونہی ٹِک ٹِک تو نہیں سُنتے رہیں ٹائم بم کی
دلِ خود سر کو دھماکے سے بچا لیں صاحب!

جبر اِس کو نہ کہیں آپ کا زنداں کر دے
اپنی خاموشی کو اِک نعرہ بنا لیں صاحب!

اگلی منزل کی تھکن نے بھی تو کر دینا ہے خاک
اور تا دیر یہیں خاک اُڑا لیں صاحب!

رات کا دم تو کوئی دم میں اُکھڑ جائے گا
ٹمٹماتے ہوئے خوابوں کو سنبھالیں صاحب!

وقت پڑنے پہ جسے سانپ بنا سکتے ہوں
گھر سے جاتے ہوئے اِک ایسا عصا لیں صاحب!

آپ کا حجرہ تو ہو سکتا ہے تب بھی روشن
روشنی ہے تو فضاؤں میں اچھالیں صاحب

چلنا پڑتی ہیں بساطِ غمِ ہستی پہ ظفرؔ
جیتنے کے لئے ہاری ہوئی چالیں صاحب!

مُٹھی بھر ہائیکو

من میں تیری لاگ
کیسے شعلہ بار ہوئی ہے
صندل بن میں آگ

پڑھ لیں اگر شعور
زنداں کی دیواروں پر ہیں
روز و شب مسطور

کریں کیوں اپنا سوگ
ارمانوں کے شوکیسوں میں
سجے سجائے لوگ

اُف تیرا پندار
میرے چاروں اور کھڑی ہے
تا بہ فلک دیوار

یوں مانوس کیا ہو
دیدۂ معذور سے جیسے
دیکھیں دنیا کو

پیچھے دیکھ نہ پائیں
عشق کی جادونگری میں ہم
پتھر کے ہو جائیں

سُن پائے تو یار
تجسیمِ ابلاغ بنائے
حرفِ بے اظہار

ایسے ڈوبے ہیں
اپنی بات بھی کرتے ہیں ہم
تیرے لہجے میں

کیسا جذبِ سفر
جیون ٹانک دیا ہے ہم نے
گھڑی کی سوئیوں پر

دیکھے راہگذر!
کس منزل پہ لے جائے گا
یہ بے سمت سفر

دِل بے ڈور پتنگ
لہراتی ہے، بل کھاتی ہے
اپنی موج کے سنگ

کل شب جگی جو جوت
اُس کی یاد سے کتنی باتیں
کرتا رہا بے صوت

اندھے جذبے ہیں
اپنا دشمن جان کے کب سے
خود سے لڑتے ہیں

کیا کیا مچلے نہ
اِک لمحے کا بوجھ تھا اِتنا
جس سے نکلے نہ

پیاس کہاں رہ پائے
تیرے جلوؤں کے چھینٹوں سے
سورج بھی بجھ جائے

تاب ہو گیا محسوس
پتھر ہیں جو پہنے ہوئے ہیں
ریشم کا ملبوس

نکلا خاروں خار
خوشبوؤں کا پیچھا کر کے
پہنچے جس گلزار

بچہ ہے بے ناؤں
خوابوں کے تپتے رستوں پر
دوڑے ننگے پاؤں

تھام لے انگلی یار
وقت کے میلے میں کھو بیٹھا
کتنے ہی دلدار

شکوہ بہ لب کیوں ہیں
دِل ہی کہاں ہوتا ہے بُت کے
پتھر سینے میں

جذبہ شل نہ ہو
دیکھ کہیں اُس پار ابد کے
اور ازل نہ ہو

وقت، لگتا ہے کہ میرا نہیں آنا جیسے
رات کے بعد سویرا نہیں آنا جیسے

آج کے صید اِسی ذعم میں بے فکر تھے کل
اُن تلک جال کا گھیرا نہیں آنا جیسے

ایسے آفاق کے بےانت سفر پر نکلے
اِن اڑانوں میں بسیرا نہیں آنا جیسے

خوف پھنکارتا پھرتا ہے بھری بستی میں
سانپ آنے ہیں، سپیرا نہیں آنا جیسے

ایسے لہرائے ہیں نیزوں میں پروئے ہوئے سر
اب کے غیرت کا پھریرا نہیں آنا جیسے

اپنے آنے کا بتاتا رہا کوئی مجھ کو
اِس تیقن سے بہتیرا۔۔۔نہیں آنا جیسے

یوں اُڑائے چلے جاتا ہوں ہوا میں گاڑی
سرِ راہے کوئی ڈیرا نہیں آنا جیسے

میں نے سارے ہی دیئے اپنے بجھا ڈالے ہیں
دِن جو نکلے تو اندھیرا نہیں آنا جیسے

نہیں باور کہ رُتوں کو ہی بہا لے گا ظفرؔ
ابر اِتنا بھی گھنیرا نہیں آنا جیسے

یار! کیا ترکِ تعلق کی میں تعلیل کروں
یہ کلینڈر کا صفحہ ہے کہ میں تبدیل کروں؟

آمریت ہے عجب دل کی، توقع رکھے
حکمِ ناگفتہ سنوں، سنتے ہی تعمیل کروں

اپنے ہر پل پہ نچوڑوں ماہ و سالِ رفتہ
اپنی ہر شام تری یادوں میں تحلیل کروں

یہ مرا شہر کہیں گرد وُ دخاں میں گم ہے
کیسے ابلاغِ پس و پیش کو تمثیل کروں

برگِ امید سے عاری ہیں گلستاں کے شجر
وہاں کس طور کسی رُت کی میں ترسیل کروں

ہر خرابے سے نئے خواب کی کونپل پھوٹے
میں اگر حسرتِ تعمیر کی تشکیل کروں

اپنی خاموشی میں چھیڑوں جو فسانہ دل کا
حرفِ اجمال کو ہم رنگیٔ تفصیل کروں

پوچھنے پر بھی کوئی بات نہیں کہہ پایا
کس قدر اور مسائل کی میں تسہیل کروں

یہی میثاقِ محبت میں لکھا ہے کیا ظفرؔ
اپنی بربادی کے اقدام کی تعجیل کروں

یہ رُتیں ہیں دوسروں کے گھر تلک
تم دریچہ لے چلو منظر تلک

اِک مہک سینے سے لگ کے رو پڑی
آنکھ پہنچی بھی نہ تھی اُس در تلک

صرف خوابوں پر ہی پابندی نہیں
آ گئی ہے بات بال و پر تلک

چاک سے اُترے تو ہو گی شکل کیا
یہ بتا پایا نہ کوزہ گر تلک

دیدۂ سرمست سے واقف نہیں
ظرفِ رِنداں ہے ابھی ساغر تلک

اپنی ہی خاموشیوں کی گونج سے
بارہا ٹھہرا اُٹھا اندر تلک

میری ساری عمر کھا جاتی ہے روز
یہ جو گھر سے دوڑ ہے دفتر تلک

زندگانی سے تھکا ہارا تھا میں
سو گیا ہوں اِک ذرا محشر تلک

اَن دِکھے ڈر نے یوں بولایا ظفرؔ
بچتے بچتے آ گیا اژدر تلک

میں جس پہ اپنی نگاہوں کا رنگ کر لیتا
وہ کیسے میرے مقدر سے جنگ کر لیتا

ہوا کی ڈور مرے ہاتھ میں نہیں آتی
وگرنہ ساری رُتوں کو پتنگ کر لیتا

تمام دنیا کو رکھتا میں گھر کے نقشے میں
یوں بے گھری میں بھی دنیا کو دنگ کر لیتا

ملی تھی خلعتِ حسرت اگر عزیزوں سے
میں اس کا ذائقہ رشک امنگ کر لیتا

مجھے دبوچ نہ لیتا سکوتِ تنہائی
لہو میں پیدا اگر جلترنگ کر لیتا

ندی کی نیتِ سیلاب کا پتہ نہ چلا
شگوفوں کو سرِ آغوشِ سنگ کر لیتا

تمھارے بعد اگر زندگی بچی ہوتی
کسی طرح سے بھی جینے کا ڈھنگ کر لیتا

بڑا تھا، دھرتی کی کٹیا میں آ نہ سکتا تھا
گلیمِ گردوں ہی لے کر ملنگ کر لیتا

مجھے ڈراتی نہ ظلمت اگر میں خود کو ظفرؔ
چراغِ راہگزر سا دبنگ کر لیتا

دِل، مرا دِل تیری یادوں کا عجائب خانہ
درد کی کون سی منزل پہ ہوا دیوانہ

میں کہ اپنی ہی تمناؤں کے ہاتھوں اُجڑا
کیا بسائے گا مجھے شہر کا یہ ویرانہ

سنگِ منزل سے تعارف نہیں ملنا سارا
آبلوں نے بھی مسافت کا لکھا افسانہ

میرے اندر بھی کسی پھول کی لو جاگ اُٹھے
اَبر دے جائے نئی رُت کا اگر نذرانہ

رِند مجھ سے کوئی دیکھا نہیں ہو گا تم نے
جس کو میخانے میں جا کر ہو غمِ پیمانہ

میں نے قانونِ جہاں توڑا ہے، معلوم نہ تھا
مسکراہٹ کا بھی ہوتا ہے کوئی ہرجانہ

چاند بادل سے نکل آئے میں جب بھی دیکھوں
ہو نہ ہو شمعِ نظر کا یہ ہے خود پروانہ

ہر نیا دِن نئے اہداف، نئی فکریں دے
سیکھنا پڑتا ہے جینے کا ہنر روزانہ

یہی بہتر ہے ظفرؔ خود سے لپٹ کر رو لے
رونے والوں کو نہیں ملتا ہے کوئی شانہ

عبث ہے ماہ و سال میں مری تلاش
اُٹھائے پھر رہا ہوں ایک پل کی لاش

یہ قصدِ ترکِ عشق جان کر بھی کیوں؟
اُسی طرف اُٹھے نگاہِ بدقماش

تمھاری یاد فائلوں میں کھو گئی
تمھارے غم کو کھا گیا غمِ معاش

بجھا لے یہ جہاں اناؤں کی ہوس
بدن کے طشت پہ دھرا ہوں قاش قاش

رُکی رُکی ہواؤں میں خرام ہے
ہُوا ہے سازِ رُت میں کیسا ارتعاش

بس ایک ضربِ گُل نے حشر کر دیا
مرے زمین و آسماں ہیں پاش پاش

وہ اشتہار ہوں جو چوک چوک ہے
وہ راز ہوں جو خود پہ بھی نہیں ہے فاش

عذابِ بے گھری میں ڈھل کے رہ گئی
مسافرت نے ڈال دی تھی جو خراش

یہ بُت تو بن گئے خدا ترے لئے
کہا تھا کس نے دل کے تیشے سے تراش

بس ایک جان ہی تو دینی تھی ظفرؔ
میں دامن حیات تھام لیتا کاش

جو بس میں نہیں اُس کا ارادہ نہ کیا کر
ایفا نہیں کر سکتا تو وعدہ نہ کیا کر

ہر کوئی بھٹکتے ہوئے منزل نہیں پاتا
بے سمت مسافت کو ہی جادہ نہ کیا کر

مر جائیں نہ گھٹ کر کہیں احساس کے رشتے
دیوار پہ دیوار ستادہ نہ کیا کر

دِل والوں کی تقدیر میں لکھا ہے یہ توشہ
میخانے میں جا کر غمِ بادہ نہ کیا کر

دنیا کی طرحداری ترے ناپ کی ہو گی
یادوں کو ہی جیون کا لبادہ نہ کیا کر

جانے کہاں کب کون بدل جائے سفر میں
خود پر بھی بھروسہ تُو زیادہ نہ کیا کر

بے نفع نہیں ہوتا محبت کا خسارہ
ہر سودے میں اُمیدِ افادہ نہ کیا کر

انگارے اُٹھا لیتے نہیں پھول سمجھ کے
نادانیاں ایسی دلِ سادہ نہ کیا کر

آتش بھی لبِ زنداں سے ہو سکتی ہے آزاد
گیتوں کے پرندوں سے اعادہ نہ کیا کر

گزراوقات کا باعث رہی ہیں
مگر یادیں عذابِ زندگی ہیں

رُتیں سرشاریاں لائی ہیں کیسی
کہ جو رزقِ غمِ آئندگی ہیں

بھرم اِن دیوزادوں کا نہ ٹوٹا
جو کل تھے دیوتا، وہ آج بھی ہیں

جسے میں آسماں سمجھا تھا اپنا
وہیں سے بجلیاں مجھ پر گری ہیں

یہ میرا ظرف ہے پاتال، جس میں
ڈبونے والی موجیں ڈوبتی ہیں

گزشتہ موسموں کی کُلفتیں سی
نئی رُت میں بھی بہہ کر آ گئی ہیں

پرندے آپ ہیں مجبورِ ہجرت
شجر کی بانہیں تو پھیلی ہوئی ہیں

تبسم پھیل جائے منظروں کا
گماں کے ابر سے کرنیں چھنی ہیں

مری غزلیں ہوئیں دفتر بہ دفتر
تری آنکھیں جو اِتنا بولتی ہیں

خدائی بھی نہیں باقی، خداؤں میں دھرا کیا ہے
دِکھاتے ہیں مگر اُن کی اداؤں میں دھرا کیا ہے

یہ یادِ ماضی جنگل ہے، بھٹک جاؤ گے جا کر تم
مآلِ کار دیکھو، ابتداؤں میں دھرا کیا ہے

سیاست بادلوں نے کیسی کر دی دھوپ سے مل کے
شجر بھی سوچتا ہے میری چھاؤں میں دھرا کیا ہے

کسی کو دَم نہ کرنے دوں میں آسیبِ محبت پر
جو پیچھے پڑ گئی ہیں اُن بلاؤں میں دھرا کیا ہے

یہ تنہائی تو دنیا والوں سے مل جائے گی تم کو
بھٹکتے پھر رہے ہو کیوں، خلاؤں میں دھرا کیا ہے

پجاری آئے ماتھوں پر لہو کی وحشتیں مل کے
بدن کا بتکدہ ہے، آتماؤں میں دھرا کیا ہے

اُٹھو اور بن کے خوشبو پھیل جاؤ ساری دنیا میں
یہ گیلی لکڑیاں ہیں، اِن اناؤں میں دھرا کیا ہے

زمانہ جابروں کے دستِ جابر کی ہے کٹھ پتلی
سو تم تیروں پہ دھر لو، فاختاؤں میں دھرا کیا ہے

ظفرؔ کی خامشی چلّاتی پھرتی ہے بہر جانب
کسی کی اِن نری گونگی صداؤں میں دھرا کیا ہے

قضا اِس دل سے شرمندہ ہے اب تک
ترا غم ہے کہ پائندہ ہے اب تک

تڑپ اُٹھتا ہے تیرے نام پہ دِل
یہ مردہ خانے میں زندہ ہے اب تک

پکڑ پایا نہیں ہے لے سمے کی
تبھی خاموش سازندہ ہے اب تک

جہاں سے نکلا تھا اگلے سفر پر
اُسی منزل کا جوئندہ ہے اب تک

کسی سے وقت کا جوہر نہ ٹُوٹا
کہ آئندہ تو آئندہ ہے اب تک

شبِ غم ہے گھنیری تو بھلے ہو
اگر احساس تابندہ ہے اب تک

کلیجہ ہی چبا ڈالا تھا جس نے
یہ دنیا تو وہی ہندہ ہے اب تک

نہ جانے خواب ہے یا کوئی آنسو
جو پلکوں پر درخشندہ ہے اب تک

جو خود اپنا بھی ہو پایا نہیں ہے
وہی میرا نمائندہ ہے اب تک

ستادہ سینے میں آئینۂ دل
کسی پتھر کا کارندہ ہے اب تک

۔۔ق۔۔

محبت ہے یا مجبوری اے دھرتی!
تری نسبت سے جو زندہ ہے اب تک

ستم آباد ہے بہرِ فدائی
سو کیسے تیرا باشندہ ہے اب تک

نہ کھُل کھیلے مرا بیساختہ پن
فساں تہذیب کا رِندہ ہے اب تک

ڈر کے گرداب میں چکراؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

کسی نعرے میں نہ ڈھل پاؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

جینا کر رکھا ہے دشوار جہاں اہلِ ستم نے

وہاں جی کر ہی نہ دکھلاؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

یوں تو میں بھیڑ کا حصہ ہوں مگر اپنی نظر میں

اپنی پہچان نہ کر پاؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

ساری دنیا کو طلسمات سے آزاد کروں گا

میں کہیں آپ ہی پتھراؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

کسی دریا کی طرح کیسے سمندر میں گروں میں

کوئی تاریخ نہ دھراؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

زندگی میں نے گزاری ہے مگر کیسی گزاری؟

مر کے بھی یاد نہیں آؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

میرے اندازِ نظر سے بھی گلستاں ہو زمانہ

اپنی خوشبو ہی نہ پھیلاؤں تو کیا زندہ ہوں یارو!

پھر رقصِ بھونچالی کرنا ہی پڑتا ہے
جب بجتی ہو تالی، کرنا ہی پڑتا ہے

اوروں کے کشکول یونہی کب بھر پاتے ہیں
خود کو خود سے خالی کرنا ہی پڑتا ہے

ارمانوں کے مور کو رقصِ سرمستی بھی
جب ہو دیکھنے والی، کرنا ہی پڑتا ہے

دِل کی بات یوں دل کے جام میں کب پڑتی ہے
لہجے کو ٹکسالی کرنا ہی پڑتا ہے

رنگ بھی بھرنے پڑ جاتے ہیں کرداروں میں
افسانہ دیوالی کرنا ہی پڑتا ہے

اُس کی یاد کو ساتھ بٹھا کر ذکر اُسی کا
لے کر چائے کی پیالی، کرنا ہی پڑتا ہے

زور و زر والے کیا سمجھیں اعلیٰ قدریں
کارِ بداعمالی کرنا ہی پڑتا ہے

موسم کا ہر رنگ چمن میں خود بھرتے ہیں
اور یوں ڈالی ڈالی کرنا ہی پڑتا ہے

ظلم کو عادت پڑ جائے جب قتلِ سخن کی
خاموشی کو گالی کرنا ہی پڑتا ہے

اِتنا تیرا نہیں بنا ہوں میں
جتنا خود سے جدا ہوا ہوں میں

جزوِ جاں بن چکا ہے زہرِ وفا
اور تریاق ڈھونڈتا ہوں میں

کیا ٹٹولے کسی کی چشمِ رحیم
کہیں اشکوں میں بہہ چکا ہوں میں

بس وہیں سے چلا تھا منزل کو
گھوم پھر کے جہاں گیا ہوں میں

اِک تعلق کا واہمہ سا ہے
درمیاں کا کوئی خلا ہوں میں

تیری دیوالیوں نے کیا رنگنا
اپنے رنگوں سے آشنا ہوں میں

عکس کس کا تھا، آئینہ کس کا
منعکس ہو کے رہ گیا ہوں میں

مشورہ دیتا ہوں میں اوروں کو
کس قدر خود کو جانتا ہوں میں

اِتنے چھتنار پیڑ ہیں تو ظفرؔ
اپنے سائے میں کیوں کھڑا ہوں میں

شکاری بھی خوش ہیں شکاروں سے بچ کے
کسی حادثے کے خساروں سے بچ کے

کہیں یہ تمہیں بھی بہالے نہ جائیں
بلاتے ہوئے آبشاروں سے بچ کے!

یہ مٹھی میں لے کر اندھیرے کھڑے ہیں
چمکتے دمکتے ستاروں سے بچ کے

حدوں سے نکلنا ہے خود کو گنوانا
کہ بہتا ہے دریا کناروں سے بچ کے

یہیں ماندگی کے شکنجے بچھے ہیں
ذرا سرخ والے اشاروں سے بچ کے!

زمانے سے لڑنے کے قابل نہ چھوڑیں
محافظ محافظ حصاروں سے بچ کے!

لہو کر گئی ایک شمشیر مجھ کو
جو رن سے میں لوٹا ہزاروں سے بچ کے

ہمیشہ سے ہے رائیگانی کا نقشہ
بھٹکتے ہوئے رہگذاروں سے بچ کے

رکھے گی یہیں عمر بھر کی مسافت
ظفرؔ دائروں کے مداروں سے بچ کے

میں رُک گیا ہوں، سمے کی روانی جاری ہے
کہ جل رہا ہے الاؤ، کہانی جاری ہے

فلک پہ ابر ہے کس گھات میں، خدا جانے
مری زمین پہ آتش فشانی جاری ہے

ہر آئینے میں ازل سے ہے تیرا عکس حنوط
یقیں کے ساتھ مگر بے دھیانی جاری ہے

یہ شہرِ دل کبھی ہنستا تھا، کھلکھلاتا تھا
اب اِس کا ذکر دھوئیں کی زبانی جاری ہے

یہ قافلہ نہیں رکتا فنا کے شب خوں سے
سفر حیات کا ہے جاودانی، جاری ہے

طلسمِ ہوش ربا جیسی ہے کوئی ساعت
میں سنگ آسا ہوں اور میزبانی جاری ہے

بلیک ہول سے باہر نکل نہیں پاتا
یہ رہگذار پسِ بیکرانی جاری ہے

نہ کر سکا ہوں نظر ثانی کی کوئی کاوش
یہ اور بات غمِ رائیگانی جاری ہے

کسی کی یاد کا آسیب ہے حلول ابھی
نویدؔ خود سے مری بے دھیانی جاری ہے

میرے اُس دِل کے جزیرے پہ نشاں تھے ہی نہیں
میں وہاں پر بھی ملا اُن سے جہاں تھے ہی نہیں

گفتگو کس سے ہوئی، کون قمر بن کے ملا
عکس اُس کے تو سرِ آبِ رواں تھے ہی نہیں

گوشوارۂ زماں میں کوئی اندراج نہ تھا
لامکانوں میں رہا ہوں کہ مکاں تھے ہی نہیں

دَرد ایسے تھے کہ نیندوں میں بھی رِستے رہے تھے
خواب ایسے تھے کہ آنکھوں پہ گراں تھے ہی نہیں

ہم نے دیکھے ہیں کسی اور کی آنکھوں میں بہت
غرفۂ دل سے وہ منظر جو وہاں تھے ہی نہیں

سب کو چندھیائے ہوئے تھے کسی سورج کی طرح
منکشف سب پہ تھے، کہنے کو عیاں تھے ہی نہیں

اپنی بربادی کا شکوہ نہیں بنتا تھا کوئی
دِل کے سودے میں ظفرؔ سود و زیاں تھے ہی نہیں

صدیاں جو کسی ساعتِ رفتہ سے جھڑی ہیں
بن کر میرے جیون میں صلیبوں سی گڑی ہیں

ہر بات سے رِستا ہے لہو تیرے غموں کا
لہجے میں خراشیں سی وہ یادوں کی پڑی ہیں

اُمید کی گاڑی یہاں رکتی ہی نہیں ہے
آنکھیں کسی بے خواب سے جنکشن پہ کھڑی ہیں

جی ہار نہ آشوبِ زمانہ سے مری جاں!
مایوسیاں کیا صبر و رضا سے بھی بڑی ہیں

تاروں میں نظر آتے ہیں بچھڑے ہوئے پیارے
برسوں سے یہ شکلیں اِسی منظر میں گڑی ہیں

کچھ رنگ ہیں گم گشتہ کہیں گردِ زماں میں
کچھ منزلیں قدموں کی مسافت پہ اڑی ہیں

یہ بھول نہ جانا کہیں ہنگامِ سحر میں
دیئے کی لویں رات کے لشکر سے لڑی ہیں

وہ کلیاں جو عنوانِ گلستاں کے لئے تھیں
اب تک سرِ آغوشِ گل و خار پڑی ہیں

جیون کے فسانے میں کہیں میں نہ کہیں تُو
واللہ محبت کی سزائیں بھی کڑی ہیں

چُپ میں بھی ہے عجیب فسوں بولتا ہوا
چاروں طرف میں خود کو ملوں بولتا ہوا

ٹیرس پہ اپنے ساتھ کبھی بیٹھ، چائے پی!
موسم ہے تیرا رنگِ دروں بولتا ہوا

جتنا کوئی خموش کرانے کی ضد میں ہے
اُتنا ملے ہمارا جنوں بولتا ہوا

دے نہ سکا ہے آج مری بھوک کا جواب
دھرتی پہ مدتوں سے گیہوں بولتا ہوا

میری صدا کی گونج کا جھنڈا لئے چلے
جس پل کو میں میسر نہ ہوں بولتا ہوا

میں اِتنا گونجتا ہوں کسی کے حواس میں
چپ بھی رہوں تو اُس کو لگوں بولتا ہوا

سناٹے میں تو نالہ بکف سارا شہر ہے
میں ہی ملا دیار کو کیوں بولتا ہوا

میرے خلاف دینے لگا ہے گواہیاں
سب کی رگوں میں میرا ہی خوں بولتا ہوا

ہر رات کی گپھا کا دیا ہے سحر تلک
یہ دِل کی بیکلی کا سکوں (بولتا ہوا)

ظلمتِ جبر ہے اور تابہ فلک سکتے ہیں
نہیں لگتا کبھی تارے بھی دمک سکتے ہیں

آ بھی سکتے ہیں کسی رُت میں تحیر بن کر
وہ کسی دن میرے ہونٹوں پہ مہک سکتے ہیں

دشت زادوں کو توقع نہ تھی رتی بھر بھی
خشک بادل بھی کسی روز چھلک سکتے ہیں

کسی شورش سے نچوڑیں نہیں آہنگِ سرود
یہ جو سناٹے ہیں، یہ بھی تو چھنک سکتے ہیں

عمر کی لمبی مسافت کی سزا چہ معنی
جب یہ پاؤں کسی لمحے میں اٹک سکتے ہیں

شبِ ہجراں! تیری ظلمت ہی فسانہ تو نہیں
رتجگے بھی میری پلکوں پہ چمک سکتے ہیں

کج ادائی کا اگر ظرف میسر ہو ظفرؔ
سیدھے رستے پہ بھی ہم لوگ بھٹک سکتے ہیں

جانے والوں کے غم ایک مدت سے ہیں
حبس بیجا میں ہم ایک مدت سے ہیں

اُن کو ہتھیار ہم نے کما کر دیئے
جن کے ہم پہ ستم ایک مدت سے ہیں

آج کیوں ہم کو ہر پل ہی ڈسنے لگا
یہ وجود و عدم ایک مدت سے ہیں

ہم کو جینا سکھا نہ سکی اب تلک
زیست کو ہم بہم ایک مدت سے ہیں

ٹوٹ سکتے ہیں اندھی عقیدت کے بُت
آپ کو محترم ایک مدت سے ہیں

راستے خاک منزل پہ لے جائیں گے
یہ تو زیرِ قدم ایک مدت سے ہیں

اور سورج وہاں سے نہ نکلا تو پھر؟
جس اُفق کے بھرم ایک مدت سے ہیں

سب کو کیسے بتاؤں، مرے حوصلے
آزمائش سے کم ایک مدت سے ہیں

جانے دیوارِ گریہ ہے کیوں بے صدا
یہاں اہلِ قلم ایک مدت سے ہیں

بھر سو ہے خلائے بیکرانہ
قدم رکھے کہاں میرا فسانہ

وہی جبرِ حقائق زمانہ
وہی ذعمِ ادائے ساحرانہ

میں اپنی ذات کے فٹ پاتھ پر ہوں
گزرتا جاتا ہے زن زن زمانہ

بڑی آسانیاں ہیں بے گھری میں
جہاں ٹھہریں وہی ہے آشیانہ

محبت نے جما رکھا ہو جیسے
وہی حیرت وہی آئینہ خانہ

کسی بسمل کا نظارہ ہے اور ہے
کوئی چشمِ عنایت، بیہمانہ

جو ننھا سا دیا شب بھر جلا ہے
یہی ہو گا سحر کا کارخانہ

یہ قضیہ عمر سے ممکن نہیں ہے
کہ تیرا غم تو ٹھہرا جاودانہ

ظفرؔ ہر خواب تو مدفن بنا ہے
پڑھو اپنی نمازِ غائبانہ

کیوں ٹٹولے کوئی اندازہ تبسم میرا
تھام رکھے میرا شیرازہ تبسم میرا

اِس میں کوئی بھی شگوفہ نہیں جلوہ آرا
کہ بتا پاتا تمہیں ہذا تبسم میرا

کتنی خوشیوں کا لہو میرے ہر اک اشک میں ہے
کتنے اشکوں کا ہے خمیازہ تبسم میرا

یہ ہر اک روح کا پروانۂ رہداری ہے
کھولتا جاتا ہے دروازہ تبسم میرا

مخبری کر نہ سکے رنگتِ اندوہِ دروں
جیسے چہرے کا ہو اِک غازہ تبسم میرا

آپ دنیائے سماعت نے لپک لینا ہے
سو لگاتا نہیں آوازہ تبسم میرا

گل ابلاغ کو مرجھانے نہیں دیتا ظفرؔ
کتنی صدیوں سے تروتازہ تبسم میرا

کون منظر سے گیا، بے منظری کم پڑ گئی
ایک ہی ساعت میں گویا اک صدی کم پڑ گئی

لے گیا مجھ کو بہا کر باد و باراں وقت کا
اِتنی بارش تھی کہ آنکھوں کی نمی کم پڑ گئی

کھینچتے تھے اپنی جانب راستے ہر سمت کے
اپنی "میں" سے جب میں نکلا گمرہی کم پڑ گئی

اِس قدر غم دے دئے تیرے ذرا سے ہجر نے
عمر سے لمبی تھی لیکن زندگی کم پڑ گئی

یوں تری یادیں کھلیں کہ کر دیا مبہوت سا
اِس قدر باتیں ہوئیں کہ ان کہی کم پڑ گئی

منزلوں سے ہو کے رستے پھر سے گھر کو چل دیئے
اور بھٹکاتے مگر کچھ رہبری کم پڑ گئی

اِک ذرا گرداب کو میں نے سفینہ کیا کیا
سرپھری امواج کی آشفتگی کم پڑ گئی

ایک جگنو نے دکھایا ہے وہاں اپنا طلسم
مہر و مہ کی جس جگہ پر روشنی کم پڑ گئی

تیری باتیں تیرا چہرہ تیری خوشبو تیرے رنگ
سوچنے بیٹھا تجھے تو شاعری کم پڑ گئی

یادوں کی بس اُڑی اُڑی تحریروں میں رہ جائیں گے
اِک دِن ہم بھی البم کی تصویروں میں رہ جائیں گے

آج جو ہم میں ہنستے بستے ہیں وہ خواب ہو جانے ہیں
خواب بھی وہ جو آپ اپنی تعبیروں میں رہ جائیں گے

یارو! اُس کی خوش بختی کا کیا عالم ہے، سوچو تو!!
رشتے جس کے ورثے کی جاگیروں میں رہ جائیں گے

کھُل نہ سکے گا بھید ہمارے ہونے یا نہ ہونے کا
اور معمّے ہی ساری تفسیروں میں رہ جائیں گے

رفتہ رفتہ جیون گردِ ہستی میں کھو جائے گا
لمس ہمارے عمروں کی زنجیروں میں رہ جائیں گے

دیئے اُٹھا کر ہاتھوں میں ہم رات کی اندھی نگری میں
جتنی جلدی پہنچیں گے، تاخیروں میں رہ جائیں گے

تم تو راہ بدل لو گی مجبوری کے دوراہے پر
عہدِ وفا کے روگ مری تقدیروں میں رہ جائیں گے

دنیا والو، کیا بتلائیں عشق کی کون سی منزل ہے
جن کاموں پر فخر ہے وہ تقصیروں میں رہ جائیں گے

بھر لیں گے طیور کو اپنی ٹھنڈی میٹھی باہوں میں
پیڑ، جو خود سورج کے برستے تیروں میں رہ جائیں گے

چند دوہے

دریا کی ہر موج نے ریگِ ساحل پر
کیا جانے کس موج میں لکھا کیا آ کر

سارا جیون چھاپ دے لکھے جب تقدیر
عمروں کے اخبار میں جھریاں کرے تحریر

ایسے گھر کے بام سے پھوٹے کیا تحریک
تارہ تارہ کھڑکیاں اور کمرے تاریک

رشتوں کے چوپال پر خاک اُڑاتا جائے
ہر رستہ ہی گاؤں کا شہر کو بھاگا جائے

سب میلے کی بھیڑ میں ایک ہی چہرہ ہے
ایسے میں من بالڑا کھو بھی سکتا ہے

میرے سب اوسان میں چپ کا ہے کہرام
شورشِ بے نام سے گونجیں صبح و شام

صفحۂ منظر کی ہے گیلی ہر تصویر
چاروں اور ہے میرے ہی اندر کی تحریر

یوں اُس نازک ہاتھ میں انگوٹھی پہنائیں
جیسے مفتوحہ قلعے پہ پرچم لہرائیں

اِک دوجے کے باب میں اب جو بھی ہو رائے
آ، کیفے میں بیٹھ کر پی لیتے ہیں چائے

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام	خوابوں کی پرندگی۔
شاعر	نوید ظفرؔ کیانی۔
وضاحت	یہ نوید ظفر کیانی کا ساتواں مجموعۂ کلام ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

صفحات	۲۰۳
تاریخِ اشاعت	۹ مئی ۲۰۲۵ء
ہدیہ	۱۰۰۰ روپے، $12
پبلشر	مکتبۂ ارمغانِ ابتسام۔ اسلام آباد، پاکستان۔
برقی ڈاک	nzkiani@gmail.com
ارکائیو ربط	rchive.org/details/@nzkiani

نوید ظفر کیانی

کی ادبی کائنات

ڈرامے

اِس طرح تو ہوتا ہے

مہمان

ادبِ اطفال

لالچ کی سزا

مجموعۂ کلام

جہانِ دگر

اور بارش ہو

میں اور چراغ

تخلیئے کے رنگ

رنگ و بُو کے چھینٹے

بھید خموشی کا

خوابوں کی پرندگی

یارب (زیرِ طبع)

کاوشِ یکتا (زیرِ طبع)

طنزو مزاح

ڈنکے کی چوٹ

ڈھول کا پول

زباں درازیاں

کھری کھری

ارے

دگڑ دگڑ

کچھ میٹھا ہو جائے

قلم مستیاں

فرازیالوجی

سخن کی خارش

ایسی کی تیسی

لائقِ سینسر

کھنڈ مکھانے

ڈگڈگی

اُووووو

شگفتگو (زیرِ طبع)

جیسے کو تیسا (زیرِ طبع)

شاعری قیمے والی (زیرِ طبع)

بول میری مچھلی (زیرِ طبع)

تازہ گنڈیریاں (زیرِ طبع)

شکردان (زیرِ طبع)

ظفرانیات (زیرِ طبع)

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام